بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تحریک ادب
شمارہ اگست-2024 جلد نمبر 17
Tahreek-e-adab vol-17, issue-80 August 2024

مدیر Editor
جاوید انور (Dr.Jawed Ahmad) (ڈاکٹر جاوید احمد)
cell-0091-9935957330

مجلس ادارت
Editorial board and Peer Review committee
پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبہء اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.
پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہء اردو، جموں یونیورسٹی
Prof.Shohab Inayat Malik HOD Urdu,Jammu University
ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبہء عربی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی
Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)
پروفیسر محفوظہ جان، صدر، شعبہء کشمیری، کشمیر یونیورسٹی
Prof. Mahfooza Jaan(H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)
پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہء اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)
Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)
ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہء اردو، مولانا آزاد پی۔جی۔کالج، کولکاتا
Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata
ڈاکٹر احسان حسن، شعبہء اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی
Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

نجمہ عثمان، پروفیسر عارفہ بشریٰ، رشید احمد،

عرفان عارف، ڈاکٹر چمن لال

Najma Usman (Surrey, United Kingdom)

Prof. Arifa Bushra (Dept. of Urdu,Kashmir University)

Rasheed Ahmad (Chairman Rosewood Academy,VNS)

Ishtiyaq Ahmad (General Secretary, Sir syed society Varanasi)

Irfan Arif (H.O.D.Dept. of Urdu,GDC Reasi University of Jammu,

Dr.Chaman Lal Bhagat (Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

سال اشاعت: Year of Publication 2024 (جلد نمبر 17) Vol-17

شمارہ نمبر ،شمارہ 80۔اگست، Issue August 2024

سرنامہ خطاط: انور جمال Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi

سرورق : عظمیٰ اسکرین Title cover Uzma Screen, Varanasi

فی شمارہ : دوسو روپے 200/-Two Hundred rs. per copy

زرسالانہ : دو ہزار روپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زر رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:

Jawed Ahmad IFSC SBIN0005382 A/C no. 33803738087

State Bank Of India,Branch-Shopping centre(B.H.U.Campus.B.H.U.Varanasi-221005(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارنسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے نیہا پرنٹنگ پریس، وارانسی سے شائع کرار دو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔

Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from Neha Printing Press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

1۔مدینے سے عزیزیہ اور عمرہ ادائگی (کتابِ دل)	نجمہ عثمان	5
2۔کھیل تماشے۔1 (میں زندہ آدمی ہوں)	خالد حسین	11
مضامین		
1۔ترقی پسند ادبی تحریک: ذاتی تجربات کی روشنی میں	عارف نقوی	18
2۔ترقی پسندی: نئے حالات میں	عارف نقوی	37
3۔اردو زبان وادب کا مخلص دوست:		
شہاب ظفر اعظمی	ڈاکٹر محمد ضمیر رضا	44
4۔شارب ردولوی کی تصانیف کا اجمالی جائزہ	نصیبہ خاتون	50
5۔محمد علوی کی فنکارانہ بصیرت	عظمیٰ انصاری	56
6۔نسخہ ہائے خطی	انتخاب عالم	65
7۔مثنوی "پس چہ باید کرد مع مسافر"	جنید حسین	74
نظمیں: پروین شیر، اسلم عمادی، خالد جمال		80
مہامرتیونجئے منتر	وجئے کمار "زاہد" ابرول	84
غزلیں: رفیق راز، خورشید اکبر، پون کمار، یعقوب تصور		85
افسانے: 1۔وہ گھر کیسا ہوگا	وحشی سعید	91
2۔میری کہانی کا سچ	نور شاہ	96
3۔سب سے تیز، سب سے آگے	پروفیسر اسلم جمشید پوری	99
4۔گدھے	کاچو اسفندیار خان	102
مضامین:		
1۔اقبال کی فلسفانہ شاعری کا مذہب اور سماج پر اثر	محمد جاوید	107
2۔قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں سماجی حالات کی عکاسی	ڈاکٹر ثمینہ خاتون	115

Madine se Aziziya aur Umra ki Adayegi (Kitab-e-Dil) by Najma Usman

(Surrey) U.K cell- 0044-7936-9117-11

نجمہ عثمان (سرے۔یوکے)

مدینے سے عزیزیہ اور عمرہ کی ادائیگی

۶ ذی الحج فجر کی نماز پڑھنے کے بعد آخری درود وسلام اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھیج کر ہوٹل لوٹے۔ناشتہ چھ بجے کے بعد ہی کر لیا کیونکہ کوچوں میں بیٹھنے کے لیے سات بجے تک مین ریسیپشن میں جمع ہونا تھا۔آہستہ آہستہ سارا گروپ ایک جگہ اکٹھا ہو گیا۔میری ناہید اور پروین سے ملاقات ہوئی۔میں حیران بھی تھی کہ ہم لوگ چار دن مکے میں رہے اور ان سے کہیں بھی مدبھیڑ نہیں ہوئی۔وہ خود بھی یہ بات سمجھ نہیں پا رہی تھیں جبکہ زبیر کی تو کئی دفعہ شیشوا اور منٹو سے ملاقات ہوئی۔بہر حال اب ہم ساتھ تھے اور ایک ہی کوچ میں بٹھائے گئے۔زبیر کو تسلی ہو گئی تو وہ اپنے لیے ٹیکسی کا انتظام کرنے چلے گئے۔انہیں ٹیکسی جلد ہی مل گئی۔اس وقت تک میرا موبائل کام کر رہا تھا اور میں مستقل ان سے رابطے میں تھی۔ہمارا سارا گروپ کوچوں میں بٹھا دیا گیا۔اب اس کے بعد ایک لمبے انتظار کی خوش خبری ملی۔یعنی جب تک مقامی انتظامیہ کلیرنس نہیں دے گی ہمارے کوچیں کھڑی رہیں گی۔وجوہات جو بھی ہوں گی لیکن ہم سب گیارہ بجے تک کوچ میں بیٹھے رہے۔زبیر ہم سے بہت پہلے نہ صرف عزیزیہ پہنچ گئے بلکہ چیک ان کرنے کے بعد سونے کا پروگرام بنانے لگے۔میں نے کہا بالکل آرام کرو جب ہم نزدیک پہنچیں گے تمہیں بتا دیں گے۔ہم عزیزیہ پہنچے تو سہ پہر ہو چکی تھی اور تھکن کے مارے برا حال تھا۔زبیر کو فون کر دیا تھا وہ ہوٹل کے باہر مل گئے۔میرا کمرہ فرسٹ فلور پر تھا اور میرے ساتھ کمرہ شیئر کر رہی تھیں یمنی خاتون لیلیٰ اور پاکستانی لڑکی فرح اس کے میاں ڈاکٹر تھے۔کمرہ بہت صاف ستھرا تھا، تین بیڈ اور سائیڈ ٹیبلز، کونے میں بڑی سی الماری اور سب سے بڑی نعمت تھی کشادہ ٹائلٹ اور شاور۔ہم تینوں ہی جو پڑ کے سوئے تو مغرب کے وقت آنکھ کھلی۔نماز پڑھ باہر نکلے، برابر کے کمرے میں پروین اور دوسری خواتین تھیں۔ناہید اور شاہین کے کمرے سیکنڈ فلور پر تھے۔گراؤنڈ فلور پر کھانے کا انتظام تھا ہم سب وہاں جمع ہوئے۔یہ طے پایا کہ کھانا کھا کر اور عشاء

کے بعد عمرے کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ انشااللہ امید ہے کہ طواف اور سعی بارہ سے تین کے درمیان کرلیں گے، اور کوچیں ہمیں فجر سے پہلے ہوٹل واپس لے آئیں گی۔ فجر کی نماز کے لیے رکنے کی صورت میں ہمیں اپنا واپسی کا انتظام خود کرنا ہوگا۔

ہم دس بجے کے قریب روانہ ہوئے۔ زیادہ تر لوگ اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھے تاکہ طواف کے وقت ساتھ ساتھ رہیں۔ واپسی کے لیے ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ چار بجے صبح کوچیں کہاں کھڑی ملیں گی۔ کوچ میں سفر کے دوران سارے گروپ میں زبردست وخروش تھا۔ 'تلبیہ' (لبیک اللھم لبیک) کا ورد جاری تھا۔ ترجمہ ''میں حاضر ہوں۔ یا اللہ میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں۔ بے شک تمام تعریفیں اور نعمتیں تیرے لیے ہیں اور بادشاہی تیری ہی ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔''

مرد با آواز بلند پڑھ رہے تھے اور عورتیں ہولے ہولے۔ ایک عجب روحانی سماں بندھ گیا تھا۔ وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ بارہ بجے سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ کوچیں ہمیں اتار کر آگے بڑھ گئیں۔ ہم لوگ مسجدِ حرام میں بابِ فتح سے داخل ہوئے، اندر کافی چلنا پڑتا ہے، میں نے زبیر کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ آدھی رات ہو چکی تھی لیکن سبحان اللہ یہاں دن کا سماں تھا۔ لوگوں کا ایک جم غفیر تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں عمرے کے لیے تین بار مسجدِ حرام میں حاضری دے چکی تھی مگر اس وقت جو کیفیت تھی وہ الفاظ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ ہم لوگ چلتے رہے اور جیسے ہی خانہ کعبہ کے سامنے پہنچے دل سے دعائیں نکلیں جو بھی یاد تھیں۔

سامنے وہی روح افزا منظر تھا، خانہء کعبہ کے چاروں طرف زائرین کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ ہمارے گروپ کے لوگ کوچ سے اترتے ہی اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ اس وقت وہاں میں اور زبیر تھے۔ ہم دونوں وہاں کھڑے ہو گئے جہاں سے طواف شروع کرتے ہیں، طواف کی نیت کی اور پہلے چکر کے لیے طواف کرتے ہوئے لوگوں میں شامل ہو گئے (طواف کا تفصیلی حال طواف الوداع میں شامل ہے)۔

ساتویں چکّر پر ہم آہستہ آہستہ باہر کی طرف چلنے لگے اور باہر نکل آئے۔ مقامِ ابراہیم کے سامنے دو نفل ادا کیے۔ زبیر نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا تھا جہاں میں نے نماز پڑھی، زبیر میرے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر ہم دونوں نے زمزم سیر ہو کر پیا۔ تھوڑا سا سستا کر ہم سعی کے لیے روانہ ہو گئے ، نیچے بہت رش تھا اس لیے ہم پہلے فلور پر چلے گئے۔ یہاں پر بیچ کا راستہ وہیل چیر اور آٹو میٹک بگھیوں

کے لیے تھا اور دونوں طرف پیدل چلنے والوں کا۔ بہت سکون اور آرام سے سعی انجام دی۔ زبیر میرے ساتھ ساتھ تھے، میں نے کہا بھی تم تو تیز چل سکتے ہو لیکن وہ میری رفتار سے چلتے رہے البتہ' میلین اخضرین' کے درمیان وہ دوڑنا شروع کر دیتے تھے اور آگے جا کر پھر میرا انتظار کر لیتے تھے۔ (حضرت حاجرہ علیہ السلام کا صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا، اللہ تعالی کو اتنا پسند آیا کہ ہر مرد حاجی کے لیے ان مقامات کے درمیان ایسے ہی دوڑنا مسنون قرار پایا)۔

طواف اور سعی انجام دینے کے بعد ہم اس جگہ پہنچے جہاں کوچ آنے والی تھی۔ کافی دیر انتظار کیا، نہ تو کوچ نظر آئی اور نہ ہی گروپ کے لوگ۔ بہت ڈھونڈنے پر ہمارے گروپ کے ایک گائیڈ ملے کہنے لگے آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں ہم نے تو گروپ میسیج دے دیا تھا کہ ایک تو کوچیں ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہیں دوسرے اس جگہ نہیں آسکتی۔ اس نے بہت دور اشارہ کرتے ہوئے کہا اب وہ مسجد کے دوسرے کونے پر آئیں گی۔ بے انتہا کوفت ہوئی۔ ہم تو ہوٹل واپس جانا چاہتے تھے تھکن کے مارے برا حال تھا یہاں تو کہیں بیٹھنے کا بھی ٹھکانہ نہیں تھا۔ (فولڈنگ کرسی بھی نہیں لائے تھے)۔ زبیر نے فون چیک کیا اس پر کوئی میسیج نہیں تھا۔

جو ہوا سو ہوا۔ جہاں گائیڈ بتا رہا تھا وہاں جانے کا مطلب جتنا راستہ ہم چل کر آئے تھے اتنا واپس جانا اور پھر آگے جانا۔ میں نے زبیر سے کہا اتنی دور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہم ٹیکسی کر لیتے ہیں۔ وہ ادھر ادھر معلومات کر کے آئے پتہ چلا نماز سے ڈیڑھ گھنٹے پہلے مسجد کے آس پاس کے راستے ٹریفک کے لیے بند کر دیے جاتے ہیں اس لیے اس وقت ٹیکسی ملے گی بھی تو مسجد سے بہت دور جا کر۔ اتنا چلنے کی ہمت نہیں تھی اور اِدھر نماز کا وقت قریب آ رہا تھا۔ زبیر نے میری حالت دیکھ کر کہا یہیں کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ فجر کی نماز پڑھ کر پھر ٹیکسی کر لیتے ہیں۔ اب ہم نے واپس مسجد کی طرف چلنا شروع کر دیا جس سے ہم بہت دور نکل آئے تھے لیکن مجبوری تھی کیونکہ کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ میرے پاؤں شل ہو رہے تھے لیکن میں زبیر کا ہاتھ تھامے چلتی رہی دعائیں پڑھتی رہی۔ ہم چلتے رہے۔۔ ہمیں سڑک کے اس پار ایک جگہ ایک چھوٹا سا آفس نظر آیا، شاید کوئی ہیلپ سینٹر تھا۔ اس سے ملحق اندر کی طرف ایک چبوترا سا بنا ہوا تھا جہاں دو تین بینچیں پڑی ہوئی تھیں۔ ہم سڑک کراس کر کے اس کی طرف لپکے۔ آمنے سامنے دو بینچوں پر دو انتہائی لاغر کمزور بوڑھے م سعودی بیٹھے ہوئے تھے، دونوں احرام میں تھے اور اس طرح جھکے بیٹھے تھے جیسے اب تھک کر لیٹنے والے ہیں۔ اندر کی سامنے والی بینچ خالی تھی، ہم جلدی سے جا کر بیٹھ گئے اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ بیٹھنے کا ٹھکانہ تو

ہوا۔ جب حواس قابو میں آئے تو انتہائی ناگوار بو نتھنوں سے ٹکرائی، غور کیا کہ ہم کہاں بیٹھے ہیں۔ بینچیں یقیناً بیٹھنے کے لیے رکھ دی گئی تھیں لیکن آس پاس اور ہماری بینچ کے پیچھے کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا یا کوئی گندگی کو باہر کرنے کا سسٹم تھا جو کام نہیں کر رہا تھا۔ بہر حال بدبو اس غلاظت کے ڈھیر سے اٹھ رہی تھی۔ ہم اٹھ کر کہاں جاتے کوئی چارا نہیں تھا۔ ناچار وہیں بیٹھے رہے اور دعائیں پڑھنا شروع کر دیں۔ ہمارے سامنے دائیں بائیں بینچوں پر بیٹھے بوڑھے حاجی اتنے ساکت تھے کہ مجھے تشویش ہونے لگی میں نے زبیر سے کہا ان سے پوچھو شاید انہیں پانی چاہیے ہو۔ ابھی زبیر اٹھنے کا رادہ ہی کر رہے تھے کہ آفس سے ایک نوجوان سعوی باہر آیا۔ پہلے ان حاجیوں سے کچھ عربی میں کہا یا پوچھا وہ ہلے جلے تو مجھے ان کے زندہ ہونے کا احساس ہوا۔ پھر ہمارے پاس آیا، شیطان نے ورغلایا اب یہ تم لوگوں کو یہاں سے اٹھنے کے لیے کہے گا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا آپ لوگ ٹھیک ہیں'۔ ہم نے کہا 'بالکل ٹھیک ہیں'۔ پھر پوچھا 'کہاں سے آئے ہیں' ہم نے کہا 'لندن سے'۔۔

جلدی سے بولا 'ویلکم۔۔ ویلکم'۔ ہم نے شکریہ ادا کیا۔ میں اور میرے وسوسے۔۔ میں نے احتیاطاً پوچھ لیا 'کیا ہم یہاں تھوڑی دیر بیٹھ سکتے ہیں'۔ کہنے لگا 'بالکل جب تک چاہیں' پھر اندر چلا گیا اور ہمارے لیے پانی کی بوتلیں لے کر آیا۔ ہم نے پھر شکریہ ادا کیا، پانی پیا تو جان میں جان آئی۔ وہ دونوں بوڑھے حاجی بہت کم حرکت کر رہے تھے۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں ان کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو جائے، کوئی ان کے آس پاس نہیں تھا۔ ایک نے ہم سے کچھ کہا، زبیر سمجھ گئے نماز کے لئے پوچھا تھا، انہوں نے مسجد کی طرف اشارہ کر دیا۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ سبحان اللہ مسجد الحرام میں یہ ہماری پہلی باجماعت نماز تھی۔ جن حالات میں تھی اس سے قطع نظر ہمارے لیے بہت قیمتی تھی۔ زبیر بولے 'سامنے سڑک پر جو نمازی بیٹھے ہیں میں وہاں سنت پڑھ کر آتا ہوں' کیا آپ یہاں اکیلی بیٹھ سکتی ہیں'۔ میں نے کہا 'کیوں نہیں تم نماز پڑھو، میری فکر مت کرو مجھے جماعت نہ ملی تو بعد میں پڑھ لوں گی'۔ کیونکہ ہم جہاں بیٹھے تھے وہ نماز پڑھنے کے قابل نہیں تھی۔۔ زبیر چلے گئے۔ ایک بوڑھا حاجی بھی بہ مشکل اٹھا اور چلا گیا۔ دوسرا وہیں بیٹھا رہا۔ زبیر سنتیں پڑھ کر آ گئے۔ میں نے پھر کہا 'تم جماعت سے نماز پڑھو میری فکر مت کرو، میں باہر آ کر کھڑی ہو جاتی ہوں'۔ میرا مسئلہ وہی تھا میں نیچے نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ وہ پریشان ہو گئے 'آپ اتنی دیر کہاں کھڑی رہیں گی'۔ میں نے اطمینان دلایا 'کوئی بات نہیں، تازہ ہوا تو ملے گی'۔ بہر حال ہم دونوں کھڑے ہونے لگے، اس سے پہلے وہ دوسرا بوڑھا حاجی بھی لڑکھڑاتا ہوا بینچ سے اٹھ گیا۔ اس کے گلے میں بیج تھا یقیناً کسی گروپ کے ساتھ تھا۔ شاید بچھڑ گیا تھا

۔ بے چارا کھڑا ہوا تو دیکھا اس کا احرام پیچھے سے غلاظت میں لتھڑا ہوا تھا۔ اسے شاید اس بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ میں لرز کر رہ گئی۔ اللہ تعالی کسی کو بڑھاپے میں ایسی مقدس جگہ پر بلکہ کہیں بھی بے بس و محتاج نہ کرے۔ اس کے لیے دل سے دعائیں نکلیں' پروردگار اس کی مدد فرما آگے کی منزلوں کو آسان بنا، اس کی عبادات اور حج کو قبول فرما'۔ ہم دونوں چبوترے سے اتر کر باہر سڑک پر آ گئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ نمازیوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ چاروں طرف کی سڑکیں بھر چکی تھیں۔ جو لوگ مسجد کی طرف جا رہے تھے اور آگے راستہ نہ پا کر انہوں نے وہیں سڑک پر نماز کے لیے صفیں بنا لی تھیں۔ اچانک وہ سعودی جوان اپنے آفس سے نکلا، مجھے محسوس ہوا جیسے وہ اندر سے ہمیں دیکھ رہا تھا اور ہماری پریشانی سمجھ چکا تھا۔ وہ سیدھا ہمارے پاس آیا اس کے ہاتھ میں کرسی تھی جیسے آفس میں بیٹھنے کی ہوتی ہے۔ فٹ پاتھ کے ایک طرف بچھا کر بولا' مدر یہاں نماز پڑھ لیں'۔ اس وقت وہ ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا۔ ہم دونوں نے اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ زبیر مجھے کرسی پر بٹھا کر اطمینان سے سڑک کے اس پار جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے چلے گئے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے' میرا بچہ میری وجہ سے رکا رہا، وہ مسجد تک جا سکتا تھا لیکن وہاں پتھریلی زمین پر نماز پڑھی۔ دل سے بے ساختہ اس کے اور اس کے بیوی بچوں کے لیے ڈھیروں دعائیں نکلیں۔ میں نے جلدی سے سنتیں پڑھیں، اس دوران ہجوم میں چلنے والوں میں جو عورتیں تھیں وہ مجھے دیکھ کر رک گئیں اور میرے آس پاس کھڑی ہو گئیں۔ سبحان اللہ دیکھتے ہی دیکھتے دس پندرہ عورتوں کی جماعت کھڑی ہو گئی۔ کون سوچ سکتا تھا کہ ہمیں اس طرح نماز اور جماعت مل جائے گی۔ پھر سوچا ہم اللہ تعالی کے مہمان ہیں اس کے بلاوے پر آئے ہیں تو وہ ہماری دیکھ بھال میں کیسے کوتاہی کرے گا۔ نماز ہوئی میں نے ان بوڑھے حاجیوں اور اس سعودی جوان کے لیے بہت دعائیں کیں۔ نماز ختم ہوئی خواتین جو میرے ساتھ کھڑی ہو گئی تھیں جانے لگیں۔ سب مجھ سے ہاتھ ملا کر اور اللہ حافظ کہہ کر رخصت ہوئیں۔ اللہ۔۔ اللہ میں اپنے مقدر پر نازاں ہو رہی تھی۔۔ جھولی بھر بھر کے برکتیں مل رہی تھیں۔

زبیر نماز پڑھ کر لوٹے تو ہم دونوں کرسی لے کر آفس تک گئے۔ وہ سعودی جوان ہمیں باہر کھڑا ہوا مل گیا۔ ہم نے کرسی واپس کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا، میں نے ڈھیروں دعائیں دی۔ اب نمازیوں کے واپسی کا رش شروع ہو گیا۔ زبیر کہنے لگے' آہستہ آہستہ چلتی رہیں ورنہ بہت دیر ہو جائے گی اور ٹیکسی کا ملنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ میں نے زبیر کا ہاتھ تھام لیا اور ہم اس طرف چلنا شروع ہو گئے جہاں ٹیکسیاں ملنے کی امید تھی۔ کافی لمبا راستہ تھا۔ آگے ہمیں ٹیکسیاں کھڑی نظر آئیں

،لیکن ایک افراتفری کا عالم تھا،لوگ بھاگ بھاگ کر ٹیکسی کے پاس جاتے ، بھاؤ تاؤ کرتے ،کبھی بات بن جاتی اوران کا خاندان بیٹھ کر روانہ ہوجاتا۔ یہ بھی دیکھا کی ایک ٹیکسی کو دو افراد نے گھیر رکھا ہے اور ڈرائیور دونوں کو چھوڑ کے آگے بڑھ گیا۔ بہرحال زبیر نے بڑی مشکل سے ایک ٹیکسی پکڑی۔ ہمارے سفر کے مشکل سے 25 ریال بنتے تھے لیکن وہ سو ریال پر راضی ہوا۔ ہم چپ چاپ بیٹھ گئے اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ زبیر اس ساری صورت حال سے بہت کبیدہ تھے انہیں دکھ ہو رہا تھا کہ کوچ نہ ملنے کی وجہ سے مجھے اتنا چلنا پڑا۔ میں بھی خاموش تھی۔ راستہ خاموشی میں کٹا۔ ہوٹل پہنچ کر آرام کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ کوچ کا گروپ ہم سے بہت پہلے واپس آ چکا تھا۔ میری روم میٹ تازہ دم ہو کر آرام کر رہی تھیں ،میں نے بھی بستر میں گھسنے میں دیر نہیں لگائی۔ آنکھ کھلی تو فرح کے اٹھانے پر، دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ ہم لوگ نیچے گئے، ناہید اور پروین بھی مل گئیں۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر باہر لاؤنج میں بیٹھے، پھر ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ نماز پڑھ کے ہم نیچے لاؤنج میں بیٹھے رہے۔ کچھ لوگ باہر شاپنگ کے لیے نکل گئے۔ ہوٹل کے سامنے ہی ایک ٹھیلے والا آ کر کھڑا ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گرد خواتین کا مجمع لگ گیا۔ میں ناہید اور پروین کے ساتھ نکلی یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا مل رہا ہے۔ شاہین بڑی مستعدی سے شاپنگ میں مصروف تھیں۔ پتہ چلا بچوں کے کھلونوں سے لے کر، اسکارف، عبایے، تسبیحاں اور گھر کی سجاوٹ کے لیے فریم شدہ آیات تک مل رہی تھیں۔ ہم کچھ دیر کھڑے ہو کر تماشا دیکھتے رہے۔ میں نے شاہین سے کہا اتنا سامان کیسے لے جاؤ گی ،ہنس کر بولیں 'میاں کا سوٹ کیس خالی ہے یہ سب ان کے سامان میں جائے گا'۔ اس کے بعد غالباً وہ مزی شاپنگ کے لیے بھی کسی بازار تک گئیں۔ ہم لوگ کچھ دیر بعد لاؤنج میں واپس آ کر بیٹھ گئے۔ وہیں بیٹھ کر چائے پی اور گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ حج کے دوران یہ شاید واحد دن ملا تھا جو ہم تسلی سے بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔ عصر کی نماز پڑھ کر اپنے اپنے کمروں میں آرام کیا۔ مغرب اور عشاء پڑھنے نیچے گئے تو زبیر نے بتایا۔ کھانے کے بعد گروپ میٹنگ ہے۔ اس دن رات کا کھانا بھی ہم سب نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھایا ورنہ اب تک تو بس بھاگتے دوڑتے ملاقات ہو جاتی تھی۔ بہرحال گروپ میٹنگ میں بتایا گیا کل صبح ہماری منیٰ کو روانگی ہے۔ اپنا مختصر اور ضروری سامان پیک کر لیں باقی وہیں کمرے کی الماری میں چھوڑ دیں۔

☆☆☆

Khel Tamashe-1 (Main Zinda Aadmi hoon) by Khalid Hussain

RTD. DC (Jammu) cell-7006898585, 9419183485

خالد حسین (جموں)

کھیل تماشے-I

بڑھا کر ہاتھ ساری حد مٹا دے، زمینوں کے کشادہ قد مٹا دے
کبھی بچے کو نقشہ مت دکھانا، نہ جانے کونسی سرحد مٹا دے (لیاقت جعفری)

بھارت اور پاکستان کے رشتوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ لوہار کی سانسی کبھی آگ میں ہوتی ہے اور کبھی پانی میں۔ ایسے سیمابی رشتوں کی وجہ سے عوام ہمیشہ دُکھ، درد اور تکلیف کا شکار رہتے ہیں۔ خاص کر پنجاب اور جموں وکشمیر کے لوگ۔ بداعتمادی کے ان رشتوں کے زخموں کو ہمارے لوگوں نے 1947ء سے اپنے تن من پر سہا ہے۔ بھارت اور پاکستان کی منفی سیاست ہمارے ہاتھوں کا چھالا بن چکی ہے۔ نفرت اور ہندو مسلم دشمنی نے 1947ء میں لاکھوں لوگ مروائے۔ 1965ء میں اور 1971ء کی جنگوں میں دونوں ملکوں میں تباہی مچی۔ 1999ء کی کرگل جنگ میں سینکڑوں فوجی جوانوں نے جان گنوائی پھر بھی سیاست دانوں کی عقل ٹھکانے نہیں آئی۔ ان رشتوں میں اب جو معمولی سدھار آیا ہے وہ شاید کبھی نہ آتا اگر 9/11 کے بعد امریکہ افغانستان پر حملہ کر کے بری طرح نہ پھنسا ہوتا۔ طالبان نے امریکہ کی ناک میں دم کر دیا۔ جدید اسلحہ، ہوائی بمباری اور ہزاروں ٹن وزنی بم طالبان کی ہمت عزم اور جنگجوانا صلاحیت کو زیر نہیں کر سکے کیونکہ یہ وہی طالبان تھے جن کی جنگی تربیت امریکہ نے ہی کی تھی۔ اور اُن کے مذہبی جنُون کا فائدہ روسی فوج کو افغانستان سے باہر نکالنے کے لئے کیا تھا۔ اُن کو جدید اسلحہ دیا تھا تا کہ وہ روس جیسی سُپر پاور کے ساتھ لڑ سکیں۔ یہ وہی امریکہ تھا جس نے القاعدہ کے چیف اسامہ بن لادن کی حوالگی کا بہانہ بنا کر افغانستان پر حملہ کر دیا تھا اور طالبان کی حکومت ختم کر کے اپنی کٹھ پتلی حکومت بنائی تھی۔ یہ وہی امریکہ تھا جسے طالبان کے سربراہ مُلّا عمر نے کہا تھا کہ ''یہ بات یاد رکھنا کہ تم نے کوئی جنگ جیتی نہیں ہے اور ہم نے کوئی جنگ ہاری نہیں ہے افغانستان میں کوئی بیرونی فوج اپنی مرضی سے داخل تو ہو سکتی ہے لیکن واپس اپنی مرضی سے باہر جا نہیں سکتی اور ہماری روایت میں مہمان داری ہے، غداری نہیں۔ لہٰذا اسامہ بن لادن کو

تمہارے حوالے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا''۔ طالبان کی وجہ سے امریکہ کی اقتصادیات ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ طالبان پاکستان کے صوبوں بلوچستان اور خیبر پختون خواہ سے امریکہ اور ناٹو فوجیوں پر مسلسل حملے کرنے لگے۔ امریکہ اور ناٹو فوجیوں کا بہت جانی اور مالی نقصان ہونے لگا۔ امریکہ بلوچستان اور خیبر پختون خواہ کے فوجی ہوائی اڈے طالبان کے خلاف استعمال کرنے لگا۔ ڈرون حملے تقریباً روز کا معمول بن گئے لیکن یہ سب کاروائیاں طالبان کے عزم کو کمزور نہیں کر سکیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ پاکستان کی سرزمین سے ہندوستانی انتظام والے جموں وکشمیر میں ملی ٹینٹ کاروائیاں بھی جاری رہیں۔ پاکستان کشمیر کے نوجوانوں کو اسلحہ چلانے کی تربیت اور پیسہ دے کر کشمیر میں متواتر بھیجتا رہا۔ کشمیر میں ظلم و بربیت کا ننگا ناچ دونوں طرف سے کھیلا جانے لگا۔ پاکستان 1971ء میں ہوئی شکست اور مشرقی پاکستان کا ایک آزاد ملک بنگلہ دیش کی صورت میں عالمِ وجود میں آنے کے لئے بھارت کو ذمے دار سمجھتا ہے اور بدلے کے طور پر سرد جنگ کے اہم ہتھیار گویلا کاروائیوں کو سبق سکھانے کے لئے استعمال کرتا رہا ہے۔ اِن حالات میں دونوں ملکوں میں فوجی تناؤ بنا رہتا ہے۔ جبکہ امریکہ اس صورتِ حال کو بدلنا چاہتا تھا۔ امریکہ چاہتا تھا کہ پاکستان کے علاقوں سے طالبان اور القاعدہ افغانستان میں اپنی کارروائیاں نہ کریں۔ اس لئے وہ اپنی فوجیں جموں وکشمیر کی متنازعہ سرحد سے اُٹھا کر افغانستان کے بارڈر پر تعینات کرے تاکہ طالبان کے حملوں کو روکا جا سکے لیکن پاکستان اس کے لئے تیار نہیں تھا جب تک کہ امریکہ اُسے یہ گارنٹی نہ دے کہ ہندوستان جموں وکشمیر کی سرحد پر امن قائم رکھے گا اور مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے امریکہ ثالثی کرے گا۔ طالبان کے خلاف جنگ جیتنے کے لئے امریکہ ہر حالت میں پاکستان کی مدد چاہتا تھا۔ لہٰذا امریکی دباؤ کے تحت کرگل جنگ ختم ہوئی۔ پھر دونوں ملکوں کے درمیان بات چیت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔ پہلے بھارتیہ جنتا پارٹی کی مخلوط سرکار کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی اور پاکستان سے فوجی سربراہ جنرل مشرف کے بیچ، بعد ازاں جنرل مشرت اور وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کے درمیان۔ اس بات چیت میں ٹریک ٹُو ڈپلومیسی کا بھی اہم رول تھا اور امریکہ بھی درِ پردہ حالات بہتر بنانے کے لئے سرگرم تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں ملکوں کے لیڈران امن اور شانتی کی باتیں کرنے لگے۔ آگرہ کی تلخ یادوں کو دفن کرتے ہوئے زیتون کی شاخیں لہرانے لگے۔ جبکہ آگرہ میں دونوں ملک ایک سمجھوتے پر پہنچ چکے تھے اور دستخط کرنے کی تقریب کے لئے کرسیاں بھی سج چکی تھیں کہ سمجھوتے کی کاپی کوئی چیل جھپٹا مار کر لے اُڑی اور مشرف صاحب غصے میں واپس اسلام آباد چلے گئے لیکن اب کی بار ایسا نہیں ہو رہا تھا بلکہ

اٹل بہاری واجپائی کا وہ جُملہ بار بار دُہرایا جارہا تھا جو اُنہوں نے اسلام آباد کے عشائیہ میں کہا تھا کہ دوست تو بدلے جاسکتے ہیں لیکن ہمسائے نہیں۔ بات چیت چل نکلی تو پہلا قدم یہ اُٹھایا گیا کہ ریاست جموں وکشمیر کی متنازع سرحد کے دونوں اطراف بس سروس چلائی جائے پاسپورٹ اور ویزے کی بجائے پرمٹ سسٹم رائج کیا جائے۔ایک سمجھوتہ ہوا جس کی رُو سے سری نگر مظفر آباد کے لئے بس سروس شروع کرنے کا فیصلہ ہوا۔اُن لوگوں سے درخواستیں طلب کی گئیں جن کے رشتے دار سرحد کے دونوں طرف رہتے ہوں ۔ میرے والد خالد حسین کے ایک برخوردار اور اُردو شاعری کی معتبر آواز ڈاکٹر لیاقت جعفری نے پونچھ سے باغ اور راؤلاکوٹ جانے کے لئے درخواست دی تھی اور پرمٹ فارم بھر کر سی ،آئی ،ڈی کے دفتر میں جمع کروادیا تھا۔اُس کے سگے چچا اور پھوپھی شاید راؤلاکوٹ اور باغ میں رہتے تھے جن کو ملنے کے لئے اُس نے پرمٹ فارم پُر کیا تھا۔بس سروس چلانے کی تاریخ 7/اپریل 2005ء مقرر ہوئی تھی۔ایک بس مظفر آباد سے سرینگر آنی تھی اور دوسری سرینگر سے مظفر آباد جانی تھی۔ریاستی سرکار نے بس سروس کا نام ''کاروانِ امن'' رکھا تھا۔ابھی فارم بھرنے کا سلسلہ جاری تھا کہ ماں کی بیماری کی وجہ سے لیاقت جعفری نے پاکستانی انتظام والے کشمیر میں جانے کا ارادہ ترک کردیا۔پھر اُس نے مجھ سے رابطہ قائم کر کے پوچھا کہ کیا خالد حسین صاحب اپنے رشتے داروں کو ملنے میرپور جانا چاہتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو وہ فوراً جموں کے سی ،آئی ،ڈی محکمہ سے پرمٹ فارم حاصل کریں اور اُسے پُر کر کے ایس ،ایس ،پی نثار منہاس کے حوالے کریں جو اُس وقت سی ،آئی ،ڈی میں تھے۔میرے ابُو تیار ہو گئے۔اُنہوں نے دو فارم لیکر پُر کئے۔اپنا اور ہماری والدہ نسیم فردوس کا۔ پھر ہم دونوں نثار منہاس صاحب کے دفتر گئے۔اُن سے ملے اور فارم اُن کے سپرد کئے۔15 دن کے بعد دونوں اطراف جانے اور آنے والے مسافروں کی لِسٹ معہ موبائل نمبر اخباروں میں شائع کی گئی ۔میرے ابُو اور والدہ کے نام فہرست میں شامل تھے۔ایک دن صبح ہم ناشتہ کر رہے تھے اور میں ابُو کے پاس ہی بیٹھا تھا کہ اُن کا موبائل بجنے لگا۔ایک انجان نمبر سے کال آرہی تھی۔ابُّو نے موبائل اٹھایا اور ہیلو کہا تو دوسری طرف سے کشمیری لہجے میں ایک شخص اردو میں مخاطب تھا اور ابُو کو مظفر آباد جانے سے روک رہا تھا۔پھر دونوں میں تُرش کلامی ہونے لگی۔ابُو کہہ رہے تھے۔

''ہم دنوں میاں بیوی ہندوستان اور پاکستان کی سرکاروں کی رضامندی سے مظفر آباد جارہے ہیں۔ہمیں وہاں جانے کے لئے باقاعدہ پرمٹ جاری ہوا ہے، اور دونوں حکومتوں کا یہ فیصلہ قابل تعریف ہے جس کیوجہ سے تقریباً 60 سال کے بعد سرحد کے آر پار رہنے والے رشتے دار ایک

دوسرے کو مل سکیں گے۔ اس سے آپ کو کیا تکلیف ہے؟.....کیا کہا۔ ''بس چلنے سے آپ کی تحریک کو نقصان پہنچے گا''.....ایسی تحریک کا بند ہونا ہی بہتر ہے جس کا آر پار بس چلنے کی وجہ سے نقصان پہنچتا ہے۔'' یہ فون کال کسی ملی ٹینٹ تنظیم کے رُکن کی طرف سے آئی تھی اور اُس نے ابُّو کو دھمکی دی تھی اور کہا تھا کہ اگر اُن کی بات نہیں مانی گئی تو ابُّو اپنی اُلٹی گنتی شروع کر دیں۔ اس پر ابُّو نے جواب دیا تھا۔

''اگر تم لوگوں کی گولی سے میری موت لکھی ہے تو دُنیا کی کوئی طاقت مجھے بچا نہیں سکتی اور اگر اللہ سائیں نے میری زندگی لکھی ہے تو دُنیا کی کوئی طاقت مجھے مار نہیں سکتی۔''

یہ فون کال لندن سے آئی تھی۔ ابُّو نے جموں وکشمیر کے انسپکٹر جنرل پولیس (سی، آئی، ڈی) شری اشوک بھان کے نام ایک خط لکھا جس میں فون کال کا نمبر اور ملی ٹینٹ سے ہوئی بات چیت کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔ بھان صاحب نے ابُّو کے موبائل نمبر پر ہوئی بات چیت کی ریکارڈنگ متعلقہ ٹیلی کام ادارے سے منگوائی اور وزیر اعلیٰ مفتی محمد سعید صاحب کو سنائی۔ وزیر اعلیٰ نے دوسرے روز وہ ریکارڈنگ اسمبلی میں ممبران کو سنائی اور ملی ٹینٹوں کے خلاف دو چار بیان بھی داغ دیئے جب ٹیلی ویژن چینل والوں کو پتہ چلا تو سارے ابُّو کا انٹرویو لینے دوڑ پڑے۔ شاید ہی کوئی نیشنل چینل بچا ہو، جس نے اس واقع کو کَوَر نہ کیا ہو اور ابُّو کا انٹرویو نہ لیا ہو، یہاں تک کہ بی، بی، سی ریڈیو، الجزیرہ اور امریکی ٹیلی ویژن والوں نے بھی اس خبر کو نشر کیا اور دکھایا۔ ابُّو کا کہنا تھا کہ وہ مظفر آباد ضرور جائیں گے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ 4/اپریل کی شام بخشی نگر جموں سے جگدیش راج ٹنڈن ابُّو سے ملنے کے لئے آئے اور کہنے لگے کہ اُن کا ایک بھائی اور دو چچا زاد بھائی ''ہٹیاں دوپٹہ'' میں رہتے ہیں۔ آپ سے گذارش ہے کہ اُن کا پتہ لگوائیں اور میری فون پر اُن سے بات کرائیں۔ میں مرنے سے پہلے اُن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ہم ''ہٹیاں دوپٹہ'' کے رہنے والے ہیں۔ میرے پتا جی لالہ ہری چند وہاں کے ایک بڑے دکاندار تھے۔ اُن کی دوستی وہاں کے مسلم نمبر دار سے بہت گہری تھی۔ خاندانی تعلقات تھے۔ نمبر دار کے بیٹے کی شادی تھی اور ہم سب اُس کی خوشیوں میں شامل ہونے کے لئے اُس کے گھر گئے تھے کہ اُسی رات قبائلی حملہ ہوا اور بلوائی مار کاٹ کرنے لگے۔ میرے پتا جی، ماتا جی، چاچا جی، چاچی اور میرا بھائی بستی رام ٹنڈن نمبر دار کے گھر سے افراتفری میں نکلے۔ میرا سب سے چھوٹا بھائی اور دونوں چچا زاد بہت چھوٹے تھے، لہٰذا نمبر دار نے کہا کہ آپ جائیں۔ یہ بچے میرے پاس رہیں گے۔ حالات دیکھ کر میں انہیں آپ کے پاس لے

کرآؤں گا یا بھجوادوں گا۔ جب ہم اپنے گھر پہنچے تو مکان جل رہا تھا اور دوکان لوٹ لی گئی تھی۔ چنانچہ ہم بھاگتے بھاگتے حاجی پیر کے راستے پونچھ آ گئے اور اس طرح میرے بھائی ''ہٹیاں دوپٹہ'' میں ہی رہ گئے۔ نمبر دار نے اُنہیں پالا پوسا اور اپنے ہی خاندان میں اُن کی شادیاں کیں۔ ہماری دُکانیں اور زمینیں اُن کے نام واگذار کروائیں۔ اب وہ مسلمان بن چکے ہیں۔ پھر جگدیش راج ٹنڈن نے ایک کاغذ پر اُن کے ہندو نام اور مسلم نام دونوں لکھ کر دیئے اور اپنا فون نمبر بھی لکھ دیا اور کہا کہ مظفر آباد پہنچ کر ابُّو اُن کا کام ضرور کریں اور اُن کے بھائیوں کے ساتھ بات کروائیں۔ 5/اپریل 2005ء کو ابُّو، امّی اور میں سرینگر کے لئے روانہ ہوئے۔ وہاں ہم ابُّو کے دوست اور وزیر خوارک انکل تاج محی الدین صاحب کے گھر ٹھہرے۔ 6/اپریل 2005ء کو ہم صبح ریاستی سیاحتی مرکز (Toursit Reception Centre) سرینگر گئے۔ وہاں ابُّو اور امّی کو شناختی کارڈ دیئے گئے۔ سیاحتی مرکز میں مظفر آباد جانے والے 26 مسافر ٹھہرے تھے۔ شناختی کارڈ وصول کرنے کے بعد ہم کھانا کھانے انکل بشیر ڈار اور آنٹی جبین کے گھر گئے۔ کھانے کے بعد ابُّو نے جبین آنٹی کو ٹیلی ویژن آن کرنے کے لئے کہا۔ جوں ہی ٹیلی ویژن آن ہوا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ٹورسٹ ریسپشن سنٹر جل رہا ہے اور آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ تقریباً سارے چینل اسے دہشت گردی کی کارروائی بتا رہے تھے۔ ٹی، وی اینکر بتا رہے تھے کہ دو اُگروادی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر سیاحتی مرکز کے اندر گھس آئے اور انہوں نے اندھا دھند گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ وہاں تعینات فوجی جوانوں نے جوابی فائرنگ کی۔ وہ دونوں اُگروادی سیاحتی مرکز کی عمارت میں چھپے تھے۔ ہمارے بہادر جوانوں نے دونوں اُگروادیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے لیکن گولی باری میں سیاحتی مرکز کو آگ لگ گئی۔ اینکر بتا رہے تھے کہ سیاحتی مرکز کی ایک ملازم بھی زخمی ہوئی ہے۔ ابُّو حیران تھے کہ جب وہ لوگ سیاحتی مرکز کے اندر گئے تھے تو تین جگہ اُن کی تلاشی لی گئی تھی اور مین گیٹ کے علاوہ باقی دونوں جگہوں پر بھی بڑے بڑے کیلوں والے بیری کیٹ لگائے گئے تھے۔ پھر تینوں جگہوں کے بیری کیٹ اِن اُگروادیوں نے کس طرح موٹر بائیک پر عبور کئے اور اندر جا کر کارروائی کی۔ اس واقع کی تحقیقات کبھی نہیں ہوئی اور نہ ہی اُگروایوں کی لاشیں دکھائی گئیں۔ سیاحتی مرکز کو جلتا دیکھ کر میری امّی بے ہوش ہو گئیں اور اُنہوں نے مظفر آباد جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اتنے میں میری بہن ڈاکٹر ہُما تبسم اور جیجا ڈاکٹر عشرت چوہدری بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ بھی ابُّو کو کہنے لگے کہ وہ نہ جائیں، لیکن ابُّو بضد تھے کہ وہ ضرور جائیں گے البتہ بولے کہ اپنی ماں کو لے جاؤ۔ سرینگر کے سیاحتی مرکز کو آگ لگنے کی وجہ سے پاکستانی کشمیر جانے

والے مسافروں کو ڈل جھیل میں بنے سنتور ہوٹل میں منتقل کیا گیا۔ جہاں سے 9 لوگ بھاگ گئے جو باقی رہ گئے، انسپکٹر جنرل پولیس کشمیر جاوید مخدومی صاحب اُن کا حوصلہ بڑھا رہے تھے اور سفر خرچ کے لئے دس دس ہزار روپئے ہر فرد کو دے رہے تھے۔ اُن کی حفاظت کے لئے پولیس کا ایک خصوصی دستہ بھی تعینات کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ ریاستی سرکار کو یہ ڈر تھا کہ اگر ان میں سے مزید کوئی بھاگ گیا تو جگ ہنسائی اور شرمندگی ہوگی کیونکہ 7/اپریل کو پردھان منتری ڈاکٹر منموہن سنگھ، یو، پی، اے کی چیئر پرسن شریمتی سونیا گاندی، وزیر خارجہ نٹور سنگھ، غلام نبی آزاد اور کچھ دیگر مرکزی لیڈر مظفر آباد جانے والی بس ''کاروانِ امن'' کو ہری جھنڈی دکھا کر روانہ کرنے والے تھے۔ 7/اپریل 2005ء کی صبح ایک ڈی، ایس، پی ابُّو اور امّی'' کو لینے کے لئے تاج انکل کے گھر آیا۔ وہ اپنی سرکاری جیپ لے کر آیا تھا دو سپاہیوں نے ابُّو اور امّی کا سامان جیپ میں رکھا۔ ابُّو نے امّی سے کچھ نہیں کہا لیکن امّی چپ چاپ ابُّو کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سبھی مسافر سنتور ہوٹل سے امر سنگھ کلب سے متصل کرکٹ گراؤنڈ میں لائے گئے۔ ابُّو اور امّی بھی لولیس کی جیپسی میں کرکٹ اسٹیڈیم پہنچے۔ بس کو خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ ریاستی سرکار کی ساری انتظامیہ چیف سکریٹری ڈاکٹر سدھیر سنگھ بلوریہ صاحب کی سربراہی میں موجود تھی۔ سب سے پہلے جموں وکشمیر کے وزیر اعلیٰ مفتی محمد سعید اپنی دُختر مجبوبہ مفتی کے ساتھ پہنچے جو پی ڈی پی کی صدر تھیں۔ وہ پردھان منتری کے استقبال کیلئے کھڑے تھے۔ اتنے میں ڈاکٹر منموہن سنگھ، شریمتی سونیا گاندھی، نٹور سنگھ، غلام نبی آزاد، منی شنکر ایئر وغیرہ کرکٹ گراؤنڈ میں تشریف لائے۔ پردھان منتری نے سبھی مسافروں کو ایک ایک یادگاری مومنٹو دیا اور خصوصی ٹوپی پیش کی۔ مسافروں کو بس میں بٹھایا گیا۔ وزیر اعظم نے کاروانِ امن کو ہری جھنڈی دِکھائی، اور بس مظفر آباد کے لئے روانہ ہوگئی۔ ابُّو اُس وقت حیران رہ گئے جب اُنہوں نے محترمہ مجبوبہ مفتی کو بھی بس میں سوار ہوتے دیکھا۔ وہ سیدھی ابُّو کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ اور کہنے لگیں کہ سب مسافروں کی ذمے داری اب اُن کے سپرد کی جاتی ہے۔ اس بس سروس کے خلاف حریت کانفرنس نے ہڑتال کی کال دی تھی جس کی وجہ سے سڑکیں ویران تھیں، قصبوں میں کوئی دُکان کھلی نہیں تھی۔ صرف سیکورٹی فورس اور پولیس کی گشت دکھائی دے رہی تھی۔ جب بس پٹن قصبے سے گذری تو دو رائفل گرنیڈ بظاہر بس پر پھینکے گئے لیکن وہ بس سے تقریباً دو تین سو فٹ دُور دھان کے کھیت میں پھٹے۔ سرینگر میں سیاحتی مرکز کو آگ لگانا اور رائفل گرینیڈ پھینکنے کا مقصد مظفر آباد جانے والے مسافروں کو ڈرانا تھا۔ اِن دونوں حادثوں کو عام لوگ خفیہ ایجنسیوں کی کارستانی بتا رہے تھے کیونکہ دونوں ملکوں میں حالات

سازگار ہو جانے سے اور کشمیر کے مسئلے کا کوئی معقول حل نکلنے سے سب سے زیادہ نقصان دونوں کی خفیہ ایجنسیوں کو ہی ہوگا۔ جنہیں ہر سال کروڑوں روپے کی گرانٹ آگ لگانے اور آگ بجھانے کے لئے دی جاتی ہے تا کہ مسئلہ کشمیر کی ہانڈی ہمیشہ اُبلتی رہے۔ میں اپنی کار میں ''کاروانِ امن'' بس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اُوڑی کے ہیڈ کوارٹر سلام آباد میں مسافروں کے لئے حکومت کی طرف سے کشمیری وازان کا انتظام کیا گیا تھا۔ دوپہر کے وقت کئی ٹیلی ویژن چینلوں کے رپورٹر مسافروں کے انٹرویو لینے لگے۔ میری امّی نے بھی دو ایک رپورٹروں کو انٹرویو دیا۔ کھانے کے بعد بس کمان پُل کی طرف چل پڑی جسے بھارتی فوج نے ''امن سیتو'' کا نام دیا تھا۔ کمان پُل کے پاس حکام نے سامان کی چیکنگ کی اور پھر سامان مزدوروں کے ذریعے کمان پُل کے درمیان تک لے جایا گیا۔ کمان پُل کے پاس بھارتی فوج نے سائبان نصب کیا ہوا تھا جو مسافروں کے استقبال کے لئے لگایا گیا تھا۔ یہاں اُوڑی بریگیڈ کے کمانڈر بریگیڈئر عطا حسنین (جو بعد میں لیفٹیننٹ جنرل بنے اور سرینگر میں 15 کور کے جنرل رہے اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں) نے مسافروں کی چائے سے تواضع کی۔ محبوبہ مفتی صاحبہ نے چائے پی اور پھر بریگیڈئر حسنین کے ساتھ کمان پل کے درمیان تک گئیں۔ اُس کے بعد سبھی مسافر کمان پل کے پار چلے گئے جہاں پاکستانی انتظام والے کشمیر کی طرف سے بس تیار کھڑی تھی اور مظفر آباد ڈویژن کے ڈویژنل کمشنر اور ڈپٹی کمشنر مسافروں کا استقبال کرنے آئے تھے۔ کمان پُل کا آدھا حصہ پاکستانی فوج کے قبضہ میں ہے اور آدھا ہندستانی فوج کے۔ ہم اسے نو مین لینڈ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جب تک سبھی مسافر بس میں نہ بیٹھے محبوبہ مفتی، ان کو پُل سے دیکھتی رہیں اور پھر پاکستانی انتظام والے کشمیر سے مسافروں کا قافلہ جب کمان پُل پر پہنچا تو بریگیڈئر عطا حسنین اور محبوبہ مفتی نے اُن کا سواگت کیا اور اُن کو ''کاروانِ امن'' والی بس میں سرینگر کے لئے روانہ کیا۔ میں یعنی اپنے ابُّو خالد حسین کا چھوٹا بیٹا یاسر عمران تین گھنٹے کی مسافت کے بعد واپس سرینگر آ گیا، محترمہ محبوبہ مفتی بہت خوش تھیں کیونکہ اُن کے والد اور وزیر اعلیٰ مفتی محمد سعید کا ''ہیلنگ ٹچ'' کا فارمولہ اور نظریہ کامیاب ہوتا دِکھائی دے رہا تھا۔

سرحدیں اچھی کہ سرحد پہ نہ رُکنا اچھا
سوچئے، آدمی اچھا کہ پرندہ اچھا

(عرفان صدیقی)

☆☆☆

Taraqqi Pasand Adabi Tahreek : Zaati Tajurbaat ki Roshni mein by
Arif Naqvi (Berlin, Germany) cell-0049-151-7068-1386
عارف نقوی (برلن، جرمنی)

ترقی پسند ادبی تحریک : ذاتی تجربات کی روشنی میں

لفظ ترقی سے ہم سمجھتے کیا ہیں؟

ترقی: یعنی بہتری یا مثبت اضافہ۔ تو کیا آپ اس کے مخالف ہیں۔ وسیع اور عملی پیمانے پر ہم اسکے مطلب سمجھیں گے بہتری ہر چیز میں۔ چاہے ہماری اپنی زندگی ہو یا ہمارے معاشرے کی، پڑوسی کی، ہمارے شہر اور ہمارے ملک کی یا ساری دنیا کی۔ بعض لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ سوالات کارل مارکس کی تھیوری کا انجام ہیں، لیکن یہ سوچنے کا طریقہ تنگ نظری کا ہے۔ ترقی اور تنزلی کے تصورات آج ہمارے سامنے نہیں آئے ہیں، بلکہ جب سے دنیا قائم ہے۔ ہماری رہنمائی کر رہے ہیں۔ چاہے وید ہوں یا بائبل اور قرآن شریف۔ یا دیگر اہم مذہبی کتابیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرمان ہوں یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یا رسول اللہ کے۔ ان سب کی باتوں میں اصلاح اور ترقی کو اہم مقام رہا ہے۔ اگر آپ کو ترقی پسندی کو تلاش کرنا ہے تو کلام پاک کا مطالعہ ضروری ہے۔ انہیں خیالات کو فلسفیوں اور دانشوروں نے اپنے اپنے طور پر اپنے وقت کے حالات کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں مقصد وہی رہا ہے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں بھی روشن خیالی کے ساتھ سوچئے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک طرف ہمارے کلاسیکی ادیبوں نے ایسے اشعار لکھے جیسے میر تقی میر نے:

کل پاؤں ایک کاسہء سر پر جو آ گیا — یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھی کسو کا سر پر غرور تھا

اس میں میر صاحب نے نہ صرف دنیا کی تاریخ کھول کر ہمارے سامنے رکھ دی ہے بلکہ پورے سماج پر ایک بہت بڑے ترقی پسند شاعر کی طرح چوٹ لگائی ہے۔ حالانکہ اسی خیال کو مرزا اسد اللہ خاں غالب اپنے انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

ان صورتوں سے ان کی مراد صرف حسیناؤں کی نہیں ہے۔ بلکہ وہ وہ پوری تاریخ اور ان کی طرف بھی اشارہ کررہے ہیں جو رعونت کا شکار ہیں جیسے آج کی بعض ہستیاں جو دنیا کے حقیقی مسائل کو نظر انداز کر کے چاند، مریخ اور سورج پر قبضہ کر کے وہاں کے معدنی ذرائع پر قبضہ کے منصوبوں میں لگے ہیں۔غرضیکہ ترقی پسندی کم سے کم میری نظروں میں کوئی نیا تصور نہیں۔ البتہ ایسا تصور، خیال، یا سمجھ ہے جو ہمیں ترقی ، بہتری، اصلاح، خوبصورتی اور توانائی کے لئے سوچنے اور عمل کی دعوت دیتی ہے۔ یا آپ اسی بات کو اپنے الفاظ میں جس طرح ادا کرنا چاہیں۔لفظ پسندی بھی پسند ہی سے نکلا ہے۔یعنی اگر آپ ترقی، بہتری، اصلاح اور حسن کو پسند کرتے ہیں تو آپ ترقی پسند ہیں۔ چاہے آپ کو خود اس بات کا احساس ہو یا نہ ہو۔ جہاں تک تحریک کی بات ہے تو یہ آپ سے حرکت کی توقع ہے۔ آپ کے اپنے تصورات میں حرکت لانے کی ان میں زندگی پیدا کرنے کی۔اسے لائحہ عمل سمجھئے۔اپنے ادب کو جاندار اور افادی بنانے کے لئے۔

اس کے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ ادب میں نعرہ بازی کریں۔ کیونکہ ادب میں نعرہ بازی بچکانی ہوتی ہے۔حلانکہ اگر کوئی ادیب کہیں پر ایسا قدم خاص حالات میں اٹھاتا ہے تو اس کی آنکھ بند کر کے مذمت نہ کیجئے۔ ورنہ آپ اقبال کے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کو بھی نعرہ بازی قرار دیں گے۔اور شاعر کو ہی اپنی فہرست سے نکال دیں گے۔آپ مجروح کے اس شعر کی خوبصورتی کو بھی تسلیم کیجئے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

یا

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے (مجروح)

اسی طرح جیسے جگر مرادآبادی خوبصورتی سے پیغام دیتے ہیں:

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے (جگر)

دراصل ہمیں ادب میں خاص طور سے تنگ نظری سے کام نہیں لینا چاہئے، ورنہ ہم اردو ادب کے بڑے حصّے اور بہت سے اردو ادیبوں کو رد کر دیں گے اور زبان و ادب سے خود دشمنی کریں گے۔اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بعض ترقی پسند ادیب، خاص طور سے نئے اور جوشیلے ادیب بھی اس بات کو نہیں سمجھ پائے۔ ہمیں ترقی پسند ادبی تحریک کے بانیوں اور بزرگوں اور ایسے جوشیلے ادیبوں کی

تحریروں میں فرق سمجھنا چاہئے۔آپ ترقی پسند ادب کے مینی فیسٹو کا مطالعہ کیجئے یا سجاد ظہیر اور احتشام حسین کی تحریروں کو پڑھئے۔ان سب میں ہمیں جدت ملے گی جسکی بنیاد ہمارا کلاسیکی ادب اور ہماری روایات ہیں۔سب سے زیادہ جدت تو یہ ہے کہ ادب کو زندگی سے منسلک کیا گیا ہے اور انسان کو ایک ایسے مالی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے، جو اپنے گلشن کی آبیاری کرتا ہے۔اپنے پیڑ پودوں کو سینچتا ہے۔کیاریوں کو رنگ برنگے پھولوں سے سجاتا ہے اور ان کی خوشبو کو اپنے تک محدود نہیں کرتا۔پھر جب بادسموم کے تھپیڑے اس کے گلشن کو برباد کرتے ہیں یا کوئی اس کے پھولوں کو توڑتا، مسلتا اور روندتا ہے تو اس کا دل تڑپ جاتا ہے۔کبھی اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے ہیں، کبھی اس کے دل سے آہ نکلتی ہے اور کبھی وہ ان کی حفاظت کا پیغام دیتا ہے۔تو کیا اس خطا کی سزا آپ یہ دیں گے کہ ترقی پسندی کو دقیانوسیت یا تنزل پسندی قرار دے دیں۔اور اگر آپ اس تنگ نظری کا شکار نہیں ہونا چاہتے ہیں، تو پھر ترقی پسند اور جدیدیت کا جھگڑا کیوں کھڑا کیجئے۔

حالانکہ جس طرح کہتے ہیں ''نیا مسلمان زیادہ پیاز کھاتا ہے۔'' اسی طرح بعض ترقی پسند ادیبوں نے بھی ضرورت سے زیادہ جوش دکھانے کی کوشش کی۔کچھ نے تو بال بڑھا کر، شراب اور سگریٹ پی کر اور اپنی باتوں کو زور سے کہہ کر یا عالمی دانشوروں کے اقتباسات کا استعمال کر کے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی جس سے سخت نقصان ہوا اور جب مخالفین نے حملے کئے تو اس کا جذباتی ہو کر جواب دیا جو ترقی پسند تحریک کے لئے فائدہ مند نہیں تھا۔اسی طرح سے جب ان کی تحریک کے مقابلے میں جدیدیت، مابعد جدیدیت وغیرہ کی تحریکوں کو کھڑا کیا گیا تو بہت سے ترقی پسند بھی بوکھلانے لگے جو غیر ضروری تھا۔

جہاں تک جدیدیت کا تعلق ہے مجھے اس لفظ پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ہر ترقی پسند کے تصورات میں جدیدیت ہوتی ہے۔بالکل اسی طرح جیسے جدیدیت کو ترقی پسندی کی ضرورت ہے۔اگر ہمیں اردو زبان وادب کے فروغ سے دلچسپی ہے تو ہمیں دونوں کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔لیکن ان دونوں تصورات کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی گئی۔کب، کن حالات میں اور کس مقصد سے اور کس نے؟ اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت تھی۔ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور کے زمانے پر غور کیجئے۔روس میں انقلاب ہو گیا تھا۔پہلی جنگ عظیم ختم ہو گئی تھی مگر اس کے نتائج منظر عام پر تھے۔عالمی پیمانے پر نوآبادیاتی نظام دنیا میں قائم تھا اور اس کے خلاف آزادی کی تحریکیں تیز ہو گئی تھیں۔سرمایہ دار ممالک کے درمیان مال کی کھپت اور عالمی بازار میں اجارہ داری کی جنگ جاری

تھی۔ یورپ میں جرمنی، اسپین، اٹلی وغیرہ میں فسطائیت مضبوط ہو رہی تھی اور خطرناک شکل اختیار کر رہی تھی اور نئی جنگ کے خطرات نظر آ رہے تھے۔ ان حالات میں جب ہندوستان کے کچھ دانشور یورپ گئے اور ان کی ملاقاتیں دوسرے ممالک کے دانشوروں سے ہوئیں تو یہ احساس بڑھا کہ انسانیت کو جو نئے خطرے پیدا ہو گئے ہیں ان کے خلاف ادیبوں کو بھی کچھ کرنا چاہئے۔ چنانچہ ادیبوں کی کانفرنسیں ہوئیں جن میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند وغیرہ نے شرکت کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اپنے ملک کے عوام کو بھی ان خطرات سے آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ لندن کے ایک ریستوراں میں لائحہ عمل تیار کیا گیا۔ سجاد ظہیر جہاز سے بمبئی آئے اور ہندوستان میں اس وقت کے چند ترقی پسند ادیبوں نے ملک کی سب زبانوں کے ادیبوں سے رابطے قائم کئے۔ اور لکھنو میں کانفرنس کی جس کی صدارت پریم چند نے فرمائی۔

اس وقت سب سے بڑے سوالات کیا تھے: ملک کی آزادی، نوآبادیت کا خاتمہ، عالمی امن کے لئے آواز اٹھانا، تاناشاہی کی مخالفت اور غریبی کے خلاف آواز، خاص طور سے استحصال کے خلاف اور مزدور و کسانوں کی حمایت تنگ نظری اور فرقہ وارانہ تعصب کی مخالفت۔ لیکن یہ سب ادب کے دائرہ میں۔ کلاسیکی ادب کے احترام کے ساتھ۔ نعرے بازی سے نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سامراجی، جاگیرداری اور مقامی سرمایہ داری کی طاقتیں نیز تنگ نظر فرقہ پرست قوتیں ایسی تحریک کو برداشت کر لیتیں یا اس کے خلاف قدم اٹھاتیں۔ چنانچہ ایک طرف تو انہوں نے مقابلے کی تحریک کھڑی کر کے ترقی پسند تحریک کو کمزور کرنے کی کوشش کی اور اسے لادینوں کی تحریک بھی قرار دیا دوسری طرف اس کے خلاف سرکاری کاروائیاں کی گئیں۔ لوگوں کو نوکروں سے الگ کیا گیا، ان پر پابندیاں لگائی گئیں۔ یہاں تک کہ بعض ادیبوں کو جیلوں میں ڈالا گیا اور ان کے لئے زندگی کو تنگ کر دیا گیا۔ مشکل یہ ہے کہ میں ۶۴ برس سے جرمنی میں رہنے کی وجہ سے اپنے برصغیر کی ادبی زندگی اور مسائل سے کافی حد تک دور ہو گیا ہوں۔ ویسے بھی نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا۔ لیکن کیا کروں اللہ میاں نے سوچنے کے لئے دماغ دیا ہے اور ایک دھڑکتا ہوا دل بھی، جو احساسات سے بھرا ہے۔ اس لئے میں بھی اس موضوع پر اظہار خیال کا حق رکھتا ہوں۔ دراصل ترقی پسندی تو اس وقت بھی تھی جب عمر خیام نے کہا تھا:

ایں کوزہ چو من عاشق زاری بودہ است — در بند سر زلف نگاری بودہ است
ایں دستہ کہ بر گردن اومی بینی — دستی است کہ بر گردن یاری بودہ است

اور میر تقی میرؔ نے یہ کہتے ہوئے کہ:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے پنکھری اک گلاب کی سی ہے

یہ بھی کہا تھا:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے یہ نمائش سراب کی سی ہے

اور مرزا غالب نے خیام کے خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھا تھا:

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

ان تینوں کلاسیکی شاعروں نے اپنے اشعار سے تاریخ کے اوراق کو کھول کر ہمارے سامنے واضح کر دئے تھے۔ پھر اگر ترقی پسند شاعر اور مصنف ان خیالات میں تھوڑی سی جدت پیدا کر کے پیش کر دیتا ہے مثلاً مجروح سلطانپوری کہتے ہیں:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

یا

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

تو کیا ان اشعار کو کوئی دقیانوسی یا پروپاگنڈا کہے گا؟

یا اگر کرشن چندر کے 'ڈرامے سرائے کے باہر' میں ایک اندھے بھکاری کی بیٹی منی کہتی ہے:

''بی بی کچھ کھانے کو دو گی؟ صبح سے بھوکی ہوں۔'' اور سرائے کی نوکرانی جواب دیتی ہے:

''پرے ہٹ مردار، کیوں اندر گھسی چلی آتی ہے۔ جا کسی مسٹنڈے کی بغل میں بیٹھ اور چین سے رہ۔ آگ لگے تیری جوانی کو!''

یا اسی ڈرامے میں ایک دوسرے مقام پر کرشن چندر شاعر کی زبان سے کہلواتے ہیں:

''منی میرے پاس آنسوؤں کا ایک خزانہ ہے۔ ان آنسوؤں میں انسان کی کہانی ہے۔ ان میں زخمیوں کی چیخ و پکار ہے اور کمسن بچوں اور عورتوں کے نالہ وشیون۔۔۔'' تو کیا اس ڈائلاگ میں کچھ اور جدت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یا اسے آپ نعرہ بازی اور پروپاگنڈا کہیں گے؟

دراصل روشن خیال ادیب چاہے وہ خود کو ترقی پسند کہیں یا جدیدیت کا پرستار یا کوئی اور نام دیں، اگر وہ واقعی سنجیدہ اور باعلم ہیں تو ایک دوسرے کا احترام کریں گے۔

میں تو کہوں گا کہ ادب میں اس قسم کی منفی بحث سے ادب کا ہم نقصان ہی کریں گے۔ تو پھر یہ جھگڑا کیوں کھڑا کیا گیا۔ ترقی پسندی کے مقابلے میں جدیدیت کو کیوں پیش کیا گیا اور اس کے

بعد مابعد جدیدیت کیوں سامنے آئی اور اب ادب میں کن کن ناموں سے تحریکیں سامنے آئیں گی؟ اگر اس سے اردو ادب کو فائدہ ہوتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ شوق سے دس، بیس ناموں سے نئی نئی تحریکیں شروع کر دیجئے۔ لیکن ان کا مقصد دوسرے کی مخالفت نہیں ہونا چاہئے، ورنہ ہمیں آپ کی نیت پر شک کرنا پڑے گا۔ اور یہی ہوگا کہ ''بات پہنچی تری جوانی تک۔''

اس بات کو مت بھولئے کہ دوسرے ناموں سے تحریکیں ادب کو فروغ دینے کے لئے نہیں بلکہ ترقی پسند تحریک کو کمزور بنانے کے لئے شروع کی گئی تھیں۔ ایک ایسے وقت میں جب ترقی پسند ادیبوں کی تحریک نے خود کو زرگری کے خلاف، عالمی جنگوں سے ہونے والی تباہکاریوں اور خطرات کے خلاف آوازوں اور نوآبادیاتی غلامی کے خلاف اور استحصال اور ناانصافی کے خلاف اور ظلم وستم کے خلاف اور فرقہ وارانہ تنگ نظری کے خلاف تحریک سے آئی ڈینٹی فائی کیا تھا۔ ایسے وقت میں جو قوتیں دنیا میں ترقی پسند رجحانات سے خائف تھیں انہوں نے اس تحریک کو کمزور بنانے کے لئے ایک طرف تو اس پر بہتان طرازیاں شروع کیں اور دوسری طرف اس کا متبادل پیش کرنے کی کوشش کی۔ جس کی بنیاد کھوکھلی تھی۔

اسی طرح جس طرح ہمارا دھیان قومی اور بین الاقوامی مسائل کی طرف سے ہٹانے کے لئے اور عوامی تحریکوں کو کمزور بنانے کے لئے رجعت پسند عناصر نے ان مانگوں اور نعروں پر قبضہ کر لیا ہے جو ترقی پسندوں اور قوم پرستوں کی زبانوں پر ہوا کرتے تھے۔ اور وہ ان کے گن گاتے تھے۔ جمہوریت، حریت، حب الوطنی، مساوات، نوجوانوں اور طلباء کے لئے مانگیں، خواتین کے حقوق، مزدور کسانوں کے حقوق اور بے روزگاری کا خاتمہ اور تعلیم کا فروغ ان سب نعروں کو استعمال کرتے ہوئے سماج کے ان سب طبقوں اور لوگوں کو کچلا جا رہا ہے اور منافع خوری کے لئے دنیا کو تباہی میں جھونکا جا رہا ہے۔

ذرا غور کیجئے ایک ایسے وقت میں جب ساری دنیا میں ہتھیاروں کی بڑھتی ہوئی تجارت اور ماحولیات کی بدحالی کے خلاف آوازیں تیز ہو رہی تھیں تو اس وقت کتنی سفاکی سے چٹکی بجاتے ہوئے ایسے حالات پیدا کر دئے گئے ہیں کہ ان خطروں سے متنبہ کرنے والی آوازیں کمزور ہو گئی ہیں۔ چند ملکوں کو آپس میں لڑا کر ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا ہے کہ اب ہتھیاروں کی تجارت کے خلاف آوازیں بہت کم سنائی دیتی ہیں۔ خواتین کے حقوق انسانی حقوق کا اہم حصہ ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مرد اور عورتیں مل کر آوازیں اٹھائیں۔ کیونکہ یہ ہمارے سماج کا اہم مسئلہ ہے۔ مرد اور عورت کا سوال

نہیں ہے۔لیکن بعض خواتین کو یہ سمجھایا جاتا ہے کہ وہ feminist ہوکر ہی مردوں کے اشتراک کے بغیر اپنے حقوق منوا سکتی ہیں۔مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں سے یہ کہنا کہ انہیں اپنے حقوق کے لئے اکیلے لڑنا چاہئے دیگر ترقی پسند، جمہوریت پسند اور انسانیت پسند غیر مسلموں کے تعاون پر سہارا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بھی نہایت ہی نقصان دہ طریقہ ہے۔اور ہمیں اپنے ان دوستوں سے محروم کر دیتا ہے جو مسلمان نہ ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔کیونکہ ان کی نظر میں ملک اور قوم کے ہر فرد کی اہمیت ہے اس کا مذہب یا اعتقاد چاہے جو ہو۔

آجکل یورپ میں ایک خاص تحریک انسانی حقوق کے نام پر چلائی جارہی ہے اور پھیلتی جا رہی ہے۔اس تحریک کا نام ہے 'ریگین بوگین' یعنی 'دھنک'۔ابھی کچھ عرصہ قبل جرمنی میں اس تحریک کے ماننے والے ہزاروں بغیر ماسک لگائے لوگوں کا جلوس 'کورونا' کی پابندیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے، ناچ گانوں اور جھانکیوں کے ساتھ نکالا گیا اور ریڈیو اور ٹی وی پر بڑے بڑے انٹرویو سامنے آئے۔ان کے لباس اور حلیے ایسے تھے کہ ہندوستان اور پاکستان کے ہجڑے بھی پناہ مانگیں گے۔ان کی مانگیں تھیں کہ 'گے' مردوں اور 'لیسپین' عورتوں کے ساتھ زیادتیاں اور ناانصافیاں بند ہوں۔عام طور سے لوگ اس سب کو نمائشی جلوس اور تفریح کا منظر سمجھ کر لطف لیتے رہے۔لیکن کیا یہ سب باتیں لوگوں کا دھیان اصلی مسائل سے ہٹانے کے لئے نہیں ہیں؟ ظاہر ہے کہ ہم انسانی حقوق کے لئے اٹھنے والی ہر آواز کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ان لوگوں کے ساتھ اگر زیادتیاں ہوتی ہیں تو ان کا بھی تدارک ہونا چاہئے۔لیکن یہ مت بھولئے کہ آج دنیا کے سامنے جو اصل خطرات ہیں ان کے سدباب کے لئے اٹھنے والی آوازوں کو کتنی چالاکی کے ساتھ پیچھے ڈال دیا گیا ہے۔

ایسے حالات میں ہم چاہے خود کو ترقی پسند کہیں، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا طرفدار یا اور کوئی نام پسند کرنے والا۔لیکن اگر ہم واقعی ادیب ہیں، دردمند ادیب تو ہمیں انسانیت اور اپنی زبان و ادب کے لئے پیدا ہونے والے خطرات کے خلاف مل کر آواز اٹھانا چاہئے۔اور اپنی تہذیب، زبان و ادب اور انسانیت کی فلاح کے لئے صرف قلم ہی نہیں اٹھانا چاہئے، بلکہ سوچنا بھی چاہئے۔اور اگر اپنے ادب، اپنی تحریروں اور تحریک میں اصلاح کی ضرورت ہے تو ایمانداری اور سنجیدگی سے اس کے لئے بھی قدم اٹھانا چاہئے۔ہمیں ان الزامات پر بھی ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے جن کی بنیاد پر ترقی پسندی کے مقابلے میں جدیدیت کا لفظ گڑھا گیا تھا۔

پہلا الزام تو یہی ہے کہ ترقی پسند ادیب ادب برائے زندگی میں یقین رکھتے ہیں۔اب ان سے

پوچھیئے کہ کیا ہم بائبل، یا کلام مجید میں زندگی کا پیغام نہیں پاتے ہیں۔ یا دنیا کا کوئی بڑا ناول جسے ہم بڑا شاہکار مانتے ہیں اسے زندگی سے الگ کر سکتے ہیں۔اس میں انسانیت کے لئے کوئی پیغام نہیں ہے؟ کالی داس کا شکنتلا، ٹالسٹائے کا وار اینڈ پیس، شیکسپیئر کا ہیملٹ، گوئٹھے کا فاؤسٹ، یا حافظ، خیام، میر، غالب، ٹیگور، رحیم، تلسی داس اقبال کے کلام کے بارے میں کیا کہیں گے۔اقبال کا شعر:

یقیں محکم، عمل پیہم محبت فاتح عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

یا

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں نفسِ سوختہ ءشام وسحر تازہ کریں

ان کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے (جگر)

میں سمجھتا ہوں کہ ہماری ترقی پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم ترقی پسندی اور جدیدیت وغیرہ کی بحثوں میں الجھیں اور اپنے نظریے کو بہتر ثابت کرنے کے لئے دوسرے کی کمزوریوں کو تلاش کریں، ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہم کہاں تک ساتھ چل سکتے ہیں اور کس طرح اردو زبان وادب کے فروغ اور صحتمند خیالات کی ترجمانی کر سکتے ہیں اور اس طرح انسانیت کی خدمت کر سکتے ہیں۔آج ہمارے سامنے جو عالمی منظر ہے اس میں دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ایسی خطرناک تباہی کے دہانے پر جس کی مثال اس سے قبل نہیں ملتی ہے۔ایسی حالت میں ہمیں اپنے ادب کو انسانیت کی بقاء کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔

ظاہر ہے کہ ترقی پسند تحریک پر دیدہ و دانستہ ہونے والے حملوں کا ہمیں جواب دینا چاہئے۔کیونکہ جو طاقتیں آج دنیا کو تباہی کے راستے پر لے جا رہی ہیں وہ نہیں چاہیں گی کہ لوگوں کی سوچ ترقی پسند ہو۔وہ دنیا میں ہونے والے ترقی کے مارگ پر آگے بڑھیں اور امن، سلامتی، بھائی چارے، انصاف اور خیر سگالی کا پیغام دیں اور استحصال، زرگری، ہتھیاروں کی تجارت، نسلی و مذہبی امتیاز، جنگوں، خانہ جنگیوں اور دہشت پسندی کی مخالفت کریں۔

لیکن اگر کوئی ہماری تحریک کی کسی کمزوری کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ہمیں سنجیدگی سے اس پر غور کرنا چاہئے۔اگر ہم واقعی اپنی تحریک میں سنجیدگی سے دلچسپی لیتے ہیں تو ہمیں تنقید سے گھبرانا نہیں چاہئے اگر وہ واقعی سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ ہے اور فن وشرافت کے دائرے میں ہے۔بعض ترقی پسند ادیبوں خصوصاً جونیر اور جوشیلے دانشوروں سے یہی غلطی سرزد ہوئی تھی کہ وہ اعتراضات اور سنجیدہ و پرخلوص ہمدردانہ تنقیدوں کے بیچ فرق کو نہیں پہچان سکے۔جس کی وجہ سے ان کے ردعمل میں جوش

زیادہ اور تحمل و استدلال کم تھا۔

آیئے ذرا ان الزامات کا جائزہ لیں جو ترقی پسندوں پر لگائے گئے تھے:

- تحریک سیاسی تھی
- اشتراکی نظام حیات کو واحد ذریعہ سمجھتی تھی
- ایک مخصوص جماعت کی آلہ کار ہے
- بجائے خود ایک عقیدہ ہے
- روایات کے خلاف ہے
- مذہب کے خلاف ہے۔
- صرف ترقی پسند ادیبوں کے گن گائے جاتے ہیں۔
- بزرگ ادیبوں کی مخالفت کی جاتی ہے۔ وغیرہ

ایسے ہی اور بہت سے الزامات ترقی پسند ادیبوں کی تحریک پر لگائے گئے۔ یہاں تک کہ بعض ترقی پسند ادیبوں پر ذاتی حملے بھی کئے گئے۔ ظاہر ہے کہ اس پر مختلف ترقی پسند ادیبوں نے بھی مختلف طریقوں سے ردعمل کیا۔ ایک ادیب بھی انسان ہوتا ہے۔ وہ حساس ہوتا ہے۔ اسے بھی جوش آ سکتا ہے۔ اگر اس کے نظریات یا اس پر ذاتی حملے کئے جاتے ہیں تو اس کا ردعمل بھی جوشیلا ہو سکتا ہے اور وہ بجائے ایسے حملوں کو برداشت کرنے کے یا ان کا سنجیدگی سے ٹھنڈے دل سے جواب دینے کے اپنے ردعمل میں تیزی بھی دکھا سکتا ہے جس کا اثر الٹا ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اگر ہم ترقی پسند تحریک کے بانی سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر عبدالعلیم یا احتشام حسین کی تحریروں کو دیکھیں تو ان میں ہمیں اعتدال، سنجیدگی اور سلجھاپن نظر آئے گا۔

ترقی پسند تحریک پر سب سے بڑا الزام تو یہ لگایا گیا کہ وہ اشتراکی نظام حیات کا پرچار کرتی ہے اور اس میں اشتراکیوں کا غلبہ ہے۔ حالانکہ اس الزام میں پوری حقیقت نہیں تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ ایک تحریک تھی جس میں مختلف خیالات کے لوگ ساتھ تھے۔ اسی طرح جیسے ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں مختلف نظریات اور مزاج کے لوگ تھے جو آزادی چاہتے تھے۔ ان میں سرمایہ دار بھی تھے اور مزدور بھی، مذہبی اور غیر مذہبی بھی۔ وہ سب اپنے اپنے نظریات کو پیش کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ترقی پسند تحریک میں کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ، مذہبی اور غیر مذہبی خیالات کے لوگ تھے جو تحریک کو اپنے اپنے ڈھنگ سے دیکھتے اور جان بوجھ کر یا بغیر جانے بوجھے اثر انداز ہوتے تھے۔ اس سے پوری

تحریک کو بدنام نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایسے اعتراضات کے جواب بعض جوشیلے ترقی پسندوں نے سنجیدگی سے دینے کے بجائے جذباتیت سے دئے۔ حالانکہ سینئیر ترقی پسندوں کا رویہ مختلف تھا۔ مثلاً سجاد ظہیر نے اپنی کتاب روشنائی میں لکھا:

''ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مصنفوں میں بیک وقت کئی قسم کے رجحانات ہوتے ہیں۔ بعض باتوں میں ان کی تحریروں سے حقیقت پسندی یا ترقی پسندی جھلکتی ہے اور ان کے بعض نظریے ایسے ہوتے ہیں جن میں الجھاؤ ہوتا ہے جو رجعت پرست تک ہوتے ہیں۔ ایسے مصنفوں کی تحریر کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ان کی نگارشات کا مجموعی اثر اچھا ہے، لطیف ہے۔ زندگی کی حرارت لئے ہوئے ہے اور اگر اس سے کسی حد تک بھی معاشرتی یا انفرادی حقیقت پر اس طرح روشنی پڑتی ہے جس کی مدد سے انسان زیادہ دیکھ سکتے ہیں اور ان کی زندگی کے مسائل کی سمجھ بڑھتی ہے تو ہمیں ایسے مصنفین کے رجعتی پہلوؤں کو رد کر کے ان کے حیات آفریں پہلوؤں کو اپنانا چاہئے۔۔۔'' حالانکہ سجاد ظہیر نے ان کے بعض رجحانات کو مسترد بھی کیا ہے۔ سجاد ظہیر نے دعویٰ کیا کہ اس ''تحریک میں ایک دائرے کے اندر مختلف سماجی اور سیاسی، مذہبی اور فلسفیانہ عقائد اور خیال کے ادیب موجود تھے۔''

وہ آگے چل کر ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ہم پر دوسرا الزام یعنی یہ کہ ترقی پسند ادب کی تحریک قوم کے روحانی، تہذیبی اور اخلاقی ورثے کی منکر ہے اور اسے مٹا دینا چاہتی ہے پہلے الزام کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہے۔'' وہ کہتے ہیں:

''اس بات کا ایک سیدھا جواب تو یہ تھا کہ انگریز سامراجی جو آج ہم کو اپنے وطن کی تمدنی روایات اور ایشیا کی روحانیت کا دشمن کہہ کر ہماری قوم میں ہم کو بدنام کرنا چاہتے ہیں خود ہمارے تمدن اور فنون لطیفہ، ہماری معاشرت اور اخلاق کے سب سے بڑے بدنام کنندہ تھے۔۔۔''

اس سلسلے میں سجاد ظہیر نے ایک مقام پر بہترین تجزیہ کیا ہے:

''رجعت پرستوں کا سب سے بڑا سہارا تاریخی روایات اور ان پر قائم رہنے والے اعتقادات اور عادات ہوتے ہیں۔ جو عام لوگوں کے اذہان، اطوار، رہن سہن، اور سوچنے کے طریقوں شعور اور لاشعور میں صدیوں سے پیوست ہوتے ہیں۔ خیالات اور عقائد میں تبدیلیاں آسانی سے نہیں ہوتیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ سماج کا معاشی ڈھانچہ بدل جاتا ہے، ایک قسم کی معاشرت کی جگہ دوسری

معاشرت لے لیتی ہے۔ جیسے قبائلی نظام کی جگہ جاگیرداری یا جاگیرداری نظام کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام یا سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ اشتراکی نظام لیکن سوچنے کے طریقے، تصورات اور عادتیں معاشرتی تبدیلی کے ساتھ ایک دم نہیں بدلتے۔۔۔''

سجاد ظہیر نے ترقی پسند نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا:

''۔۔۔ترقی پسندوں کے نزدیک ادب ایک فنِ لطیف ہے زندگی کو زیادہ حسین زیادہ معنی خیز زیادہ پرلطف بنانے کا ایک وسیلہ ہے۔۔۔ترقی پسند ادیبوں کا نقطہءنظر یہ ہے کہ ایک ادیب یا فن کار کا شعور اپنی قوم، اس کے مختلف طبقوں کے کردار اور ان کے سامنے درپیش مسائل کے متعلق جس قدر گہرا ہوگا حقیقت اور سچائی کا اسے جس قدر علم ہوگا، اسی قدر اسے فنی تخلیقات کو بہتر بنانے کا موقع ملے گا۔''

سجاد ظہیر نے اپنی بات کو کتنی خوبی سے واضح کیا تھا۔ ملاحظہ ہو:

''شاعر کا پہلا کام شاعری ہے، وعظ دینا نہیں۔ اصول سمجھنے کے لئے کتابیں موجود ہیں، اس کے لئے ہم کو نظمیں نہیں چاہئیں۔ شاعر کا تعلق جذبات کی دنیا سے ہے۔ اگر وہ اپنے تمام ساز و سامان تمام رنگ و بو تمام ترنم و موسیقی کو پوری طرح کام میں نہیں لائے گا اگر فن کے اعتبار سے اس میں بھونڈا پن ہوگا اگر وہ ہمارے احساسات کو لطافت کے ساتھ بیدار کرنے میں قاصر ہوگا تو اچھے سے اچھے خیال کا وہی حشر ہوگا جو دانے کا بنجر میں ہوتا ہے۔''

اور مشہور ترقی پسند نقاد پروفیسر احتشام حسین (جو لکھنو یونیورسٹی میں میرے استاد تھے) کہتے ہیں:

''شاعر اور ادیب اتنے بے شعور نہیں ہوتے کہ وہ کسی جماعت یا تحریک کے اشارے پر ادب کی تخلیق کریں اور نہ ہی ایسا کرنا کسی شاعر یا ادیب کے بس میں ہوتا ہے۔ ترقی پسند نقاد تاریخ کے تسلسل کو بیان کر کے تخلیق کار کی توجہ زندگی کے اہم مسائل کی طرف منعطف کرتا ہے۔ وہ اسے مشورہ دیتا ہے حکم نہیں۔ اب شاعر اپنے مزاج اور شعری تربیت کے مطابق ان موضوعات میں سے جو اس کی شخصیت میں جذب ہو جاتے ہیں، اپنی تخلیقات کے موضوع کے طور پر برتتا ہے۔ فنکار کو تخلیق کے لئے ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔۔۔''

غرضیکہ یہ وہ طریقہ تھا جس سے اعتراضات کا جواب دینا چاہئے تھا اور بحث کو آگے بڑھانا چاہئے تھا، جو سب کے لئے مفید ہوتی۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہئے تھا کہ ترقی پسند تحریک یا ترقی

پسند انجمن کے کاموں پر بہت سے دوستانہ اور ہمدردانہ اعتراضات بھی تھے جن پر سنجیدگی سے ردعمل ہونا چاہئے تھا اور استفادہ کرنا چاہئے تھا۔ لیکن اس بات کو بھی مت بھولئے کہ وہ ایک ہنگامی دور تھا۔ تحریک آزادی کی تیزی، دوسری جنگ عظیم کی تباہکاریاں جس کا خود ہندوستان پر مہلک اثر پڑ رہا تھا۔ پھر فرقہ وارانہ فسادات اور ملک کی تقسیم اور اس کے بعد ترقی پسند ادیبوں پر سرکاری عتاب اور مخالفین کے حملے اور پھر ترقی پسند تحریک کے بانی سجاد ظہیر کی پاکستان ہجرت اور وہاں ان کی گرفتاری اور ہندوستان میں سنجیدہ رہنمائی کی کمی۔ ترقی پسند تحریک پر یہ الزام کہ وہ مذہب کے خلاف تھی سراسر بے بنیاد ہے۔ دراصل ترقی پسند ادیب دقیانوسیت اور کٹھ ملائیت کے خلاف تھے۔ اس تحریک میں سبھی مذاہب اور عقیدوں کو ماننے والے لوگ تھے اور اگر وہ ترقی پسندی، روشن خیالی، حب الوطنی کے ساتھ بین الاقوامیت، انسانیت۔ ہمدردی، انصاف، استحصال کی مخالفت اور جنگ و زرگری اور فرقہ پرستی کے خلاف تھے اور انسانیت اور اس کی فلاح میں یقین رکھتے تھے تو ان کا استقبال تھا۔

ایک بچکانہ الزام یہ بھی لگایا گیا کہ ترقی پسند ادیبوں کے اقوال اور اعمال، فکر و فعل میں تضاد تھا۔ حالانکہ ایسے اعتراضات کرنے والے خود جانتے ہیں کہ ترقی پسند ادیبوں کو سب سے زیادہ مشکلات اور سختیاں جھیلنا پڑی تھیں۔ کتنے ہی ادیبوں کو اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھونا پڑے، یہاں تک کہ جیلوں کی سلاخوں میں بند رہنا پڑا۔ ترقی پسندوں پر ایسے اعتراضات کرنے والے شاید بھول جاتے ہیں کہ سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کو چار برس آہنی سلاخون کے پیچھے بیٹھنا پڑا تھا۔ اور ان پر راولپنڈی سازش کیس کے نام سے جو شرمناک مقدمہ چلایا گیا تھا اس میں ان کو پھانسی بھی دی جا سکتی تھی۔ جبکہ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اپنے عقیدے پر قائم تھے اور انسانیت کے لئے آواز اٹھاتے تھے۔

یہ الزام بھی کتنا بچکانہ ہے کہ ترقی پسندوں کی نظر میں وہی ادیب معتبر تھا جو کمیونسٹ ہو۔ شاید ایسے الزام لگانے والے بھول جاتے ہیں کہ تحریک کے بانی سجاد ظہیر نے خود حافظ کے بارے میں کتاب لکھی تھی اور پہلی ترقی پسند کانفرنس میں پریم چند نے صدارتی خطبہ پڑھا تھا۔ اور ملک راج آنند، مولانا حسرت موہانی جیسا قوم پرست شاعر اور احتشام حسین جیسے نقاد کمیونسٹ نہیں تھے۔ ترقی پسند تحریک پر اس الزام کو پڑھ کر بھی ہنسی آتی ہے کہ ایک دوسرے کو عظیم شاعر، عظیم افسانہ نگار عظیم نقاد ثابت کرتے تھے۔ میں صرف اتنا پوچھنا چاہوں گا کہ اگر ایک ترقی پسند دوسرے ترقی پسند کی تخلیق کو، اگر وہ اچھی ہے، پسند نہ کرے تو کیا رجعت پسند ادیبوں کی تحریروں کو پسند کرے گا۔ ظاہر ہے کہ پسند کا

معیار یہ ہونا چاہئے کہ وہ تخلیقات اعلی پائے کی ہوں اور ان سے انسانیت کا بھلا ہو۔ کیا یہ گناہ ہے کہ ترقی پسند خیالات کو ماننے والے اقبال، فیض احمد فیض، جوش، مجاز، سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، جان نثار اختر، جگر جیسے شعراء اور کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت، قراۃ العین حیدر، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کی کہانیوں اور ناولوں کو پسند کرتے ہیں۔ آج تو غیر ترقی پسند بھی ان کی تصنیفات پر سر دھنتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں اس بحث میں نہیں جاؤں گا کہ ترقی پسند ادبی تحریک کے مخالفین کن ادیبوں اور کس قسم کی تخلیقات کے گن گاتے تھے۔ اب اس اعتراض کو بھی ملاحظہ کیجئے کہ ملک کی آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک کی ضرورت نہیں رہی۔

اس کے جواب میں میں فیض احمد فیض کے ان الفاظ کا حوالہ دینا چاہوں گا جو انہوں نے اپنی وفات سے قبل برلن میں مجھے Pres Trust of India اور ریڈیو برلن کے لئے انٹرویو دیتے ہوئے کہے تھے:

''ترقی پسند ادب تو کسی وقت پابند نہیں ہے، کہ آج اسکی ضرورت ہے کل نہیں۔ اس کی ہمیشہ سے ضرورت تھی اور ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ ترقی پسند ادب کسی تنظیم کا نام نہیں ہے۔۔۔ ترقی پسند ادب کے معنی ہیں وہ ادب جو کہ ایک معاشرہ کو، انسانیت کو ترقی پر مائل کرتا ہے۔ تو اسکی ضرورت تو ہمیشہ رہے گی۔''

''جو ادب ترقی پسند نہیں ہے وہ تنزل پسند ہے۔ تنزل پسند ادب کی آج انسانیت کو کیا ضرورت ہے؟ ترقی پسند ادب کے لوگ معنی ہی نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ اسکو بہت محدود معنوں میں سمجھتے ہیں۔'' (فیض احمد فیض)

دراصل ایسا الزام لگانے والے اور مشورہ دینے والے چاہے جتنے بڑے ادیب ہوں لیکن ان کی سمجھ بہت محدود ہے۔ ترقی پسند تحریک کا مقصد صرف ملک کی آزادی کے لئے آواز اٹھانا نہیں تھا نہ ہے۔ بلکہ ساری انسانیت کی بقاء اور فلاح کے لئے اور دھرتی کو خوبصورت بنانے اور عزت کے ساتھ رہنے کے قابل بنانے کے لئے۔ ایک ترقی پسند ادیب کا رول ایک چمن کے مالی کا ہوتا ہے۔ جو اپنے گلشن کے پودوں کی آبیاری کرتا ہے۔ اپنے چمن کے پھولوں گلاب، بیلا، چمیلی، نسترن سے پیار کرتا ہے۔ انہیں کھلتا ہو دیکھ کر خوشی سے جھوم جاتا ہے ان کی خوشبو سے مست ہوتا ہے تروتازگی محسوس کرتا ہے پپیہے کی پی کہاں، کویل کی کوک اور بلبل کے ترانوں سے جھومتا ہے۔ لیکن جب کوئی اس کے پھولوں کو توڑتا ہے، مسلتا ہے، روندتا ہے اور جب بادخزاں کے زہریلے تھپڑے اس کے چمن کو اجاڑ

دیتے ہیں تو وہ تڑپ جاتا ہے۔اس کا دل رونے لگتا ہے اور اس کی چیخ نکل جاتی ہے۔ترقی پسند ادب اور ترقی پسند ادیب کا یہ رول آزادی سے قبل بھی تھا اور آج بھی ہے۔کیونکہ خزاں کے گرم زہریلے جھونکے آج اور تیزی سے چل رہے ہیں اور سارے عالم کی بقا کے لئے خطرہ بن گئے ہیں۔

آج دنیا میں چاروں طرف ہتھیاروں کی پیداوار اور تجارت اور ان کے فروخت کے لئے خانہ جنگیوں اور لڑائیوں کو ہوا دی جارہی ہے۔معدنی ذخائر کو لوٹنے کی کوششیں بڑھ گئی ہیں، منافع خوری، نسلی امتیاز، فرقہ واریت، دہشت پسندی، جارحیت، مذہبی دیوانگی، اندھی قومیت جس کا قوم پرستی سے کوئی سروکار نہیں ہے، صنعتی اور ایٹمی ترقی کے نام پر ماحولیات کو اتنا خراب کر دیا گیا ہے کہ آرکٹک میں برف پگھلنے لگی ہے، سمندر کا پانی بڑھنے لگا ہے اور کسی دن بہت سے جزیرے نما ملک ڈوب سکتے ہیں، ترقی یافتہ صنعتی ممالک کے جنگلوں میں ہفتوں آگ پر قابو نہیں پایا جارہا ہے۔موسم میں تبدیلیاں ناقابل برداشت ہوئی جارہی ہیں۔جگہ جگہ پر جمہوریت کا گلا گھونٹا جارہا ہے اور لوگوں کو بھوک، غریبی اور بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔تو کیا ان حالات میں ترقی پسند ادب کی ضرورت اور اہمیت ختم ہوگئی ہے یا بڑھ گئی ہے؟

میں اس موقع پر کسی بڑے نقاد کی حثیت سے بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ ایک حساس انسان کی حیثیت سے جسے زندگی سے پیار ہے۔ایک ایسے انسان کی حیثیت سے جسے ترقی پسند تحریک کی ابتدائی نشونما کو دیکھنے کا اور کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہے۔جس نے اس پودے کو پروان چڑھتے دیکھا تھا۔ بچپن میں میں اقبال کا یہ شعر پڑھا کرتا تھا:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز　　نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

پھر جب اسے سمجھنے کی کوشش کی تو دیکھا کہ مساوات کا یہ خیال تو کلام پاک میں بھی ہے۔ اور اس میں امن کا پیغام بھی ہے۔جب ہم سلام کرتے ہیں تو امن وسلامتی کا پیغام ہی دیتے ہی، اور یہی پیغام تو حضرت عیسیٰ نے بھی دیا تھا۔جنہیں سولی پر چڑھا دیا گیا تھا۔لیکن جب ہم اپنے بزرگوں کی قربانیوں اور اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالتے ہیں تو اقبال کے یہ الفاظ یاد آجاتے ہیں:

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں　　نفس سوختہ ءشام وسحر تازہ کریں

ایک زمانہ تھا جب ہم غلامی سے نجات، دقیانوسی خیالات سے نجات، مذہبی تعصب سے نجات، چھوت چھات کا خاتمہ، غریبی اور بھوکمری کا خاتمہ اور معاشی وسماجی ترقی چاہتے تھے۔ہم چاہتے تھے کہ ریل کے پلیٹ فارموں پر ہندو جل اور مسلم پانی کی آوازیں بند ہوں۔زندگی میں چین

اور سکون ہو۔ چنانچہ جب ترقی پسند ادب ہمارے سامنے آیا تو وہ ہمارے دلوں کی آواز تھی۔ میں ابھی نو، دس برس کا ہی تھا کہ بنگال کا قحط پڑا اور بھوکا ہے بنگال کا گیت کانوں میں گونجا۔ پھر ۱۹۴۵ء میں دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کی خوشی کے ساتھ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بموں سے ہوئی تباہکاریوں کی تصویریں دیکھیں اور کلیجہ کانپ گیا۔ انسانیت کرب سے چیخ اٹھی۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے جشن کے ساتھ ہندو مسلم فسادات کی بھیانک خبریں سنیں اور پڑھیں۔ جن میں لاکھوں انسان بھیڑ بکریوں کی طرح زبح کئے گئے اور خوشیاں ماتم میں بدل گئیں۔ اس وقت یہ ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادب ہی تھا جس نے انسانیت پر سے ہمارا اعتبار اٹھنے نہیں دیا۔ کرشن چندر، منٹو، بیدی وغیرہ کے افسانے اور ترقی پسند شعرا کی نظمیں رات کی پر ہول تاریکی میں ستاروں کی طرح روشن ہو کر زندگی اور اعتقاد کا سہارا بنیں۔ تحریک کے بانی سجاد ظہیر پاکستان میں فیض احمد فیض کے ساتھ جیل میں بند تھے۔ سارے ملک میں ایسا لگ رہا تھا جیسے ترقی پسند ادیب دوسری جنگ کے خاتمے اور آزادی آجانے کے بعد اور ان کے خلاف سرکاری زیادتیوں کی وجہ سے کنفیوز تھے۔ ایسے وقت میں بھی میرے آبائی شہر لکھنو میں آل احمد سرور کے گھر پر اور بعد میں احتشام حسین صاحب کے گھر پر ہر اتوار کو انجمن کے جلسے ہوتے تھے۔ مضامین اور کہانیاں پڑھی جاتی تھیں اور تبادلہء خیال ہوتا تھا۔ اور ہمارے شعور کی پرورش اور جلا ہوتی تھی۔ ان جلسوں میں صرف ترقی پسند ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی غیر ترقی پسند ادیبوں کا بھی خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ ان میں میں نے کبھی سیاسی بحثیں نہیں دیکھیں۔

مجھے یاد ہے ۳؍دسمبر ۱۹۵۵ء کو جب ہم لکھنو یونیورسٹی کے چند نوجوانوں نے قیصر باغ کی سفید بارہ دری میں کل ہند مشاعرہ کیا، جس کا افتتاح یوپی کے گورنر کے ایم منشی نے کیا اور سجاد ظہیر (بنے بھائی) کے خطوط پر لبیک کہتے ہوئے ملک کے بہترین شعراء نے شرکت کی تو اس میں بھی سیاست کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اس مشاعرے میں اسرار الحق مجاز نے آخری بار غزلیں پڑھی تھیں جن کے یہ اشعار مجھے ابھی تک یاد ہیں:

زمانے سے آگے تو بڑھئے مجاز زمانے کو آگے بڑھانا بھی ہے۔

اور دوسری غزل کا یہ شعر:

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا تیری زلفوں کا پیچ وخم نہیں ہے

اور پھر اپنا یہ قطعہ پڑھ کر سب کے رونگٹے کھڑے کر دئے تھے:

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے

اور بہت دور آسمانوں سے موت آواز دے رہی ہے مجھے

مجھے یاد ہے ۲۱ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو لکھنؤ کی انجمن ترقی پسند مصنفین نے میری تقی میر پر ایک فُل لینتھ ڈرامہ گنگا پرساد میموریل ہال میں کھیلا تھا۔ جس میں میں نے میر کا خاص رول ادا کیا تھا۔ اس میں بھی سیاست کی کہیں جھلک نہیں تھی ۔ یہ مثال دکھاتی ہے کہ ترقی پسند تحریک بزرگ ادیبوں اور شاعروں کا کس قدر احترام کرتی تھی ۔ پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے ایک مضمون میں اس ڈرامے کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ جس کا اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''یہ ڈرامہ اس وقت تک شہر کی تاریخ کا سب سے اچھا اردو ڈرامہ تھا۔ شاعر، ادیب، دانشور، سیاست داں، صحافی، شہر کا شاید ہی کوئی اہم فرد ایسا ہو، جو ڈرامے کو دیکھنے نہ آیا ہو۔''

(یادوں کے چراغ صفحہ ۱۰)

۱۹۵۸ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین لکھنؤ کے جنرل سکریٹر یا آغا سہیل (پروفیسر آغا سہیل، ایف سی کالج لاہور) کے پاکستان جانے کے بعد میں نے وہ عہدہ سنبھالا، حالانکہ میں کوئی بڑا ادیب اس وقت نہیں تھا۔ لیکن احتشام حسین صاحب اور دیگر لوگوں نے ہمت افزائی کی اور ہم نے اپنے جلسوں میں ان لوگوں کا بھی خیر مقدم کیا جو خود کو ترقی پسند نہیں سمجھتے تھے، لیکن ان کا ادب دوسروں کے دلوں میں جگہ پیدا کرتا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں میں لکھنؤ سے ایم اے کرنے کے بعد سجاد ظہیر صاحب کے ساتھ مل کر ہفتہ وار عوامی دور نکالنے کے لئے دہلی آ گیا۔ اس اخبار میں بھی پہلے صفحے کو چھوڑ کر اندرونی سارے صفحات ادب سے متعلق ہوتے تھے، خصوصاً نئے لکھنے والوں کی ادبی تحریروں سے متعلق۔ ان سے کبھی ہم نے سیاسی چیزیں لکھنے کے لئے نہیں کہا۔ ہم نے اگر کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس کی کہانیاں اور مجروح کی غزلیں چھاپیں تو بعض غیر ترقی پسندوں کی بھی اگر وہ صحت مند اور معیاری تھیں۔ ۸ر نومبر ۱۹۵۹ء کو بمبئی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جو نیا مینی فیسٹو منظور کیا گیا اس میں بھی دیگر باتوں کے ساتھ کہا گیا تھا:

''ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے درمیان بعض نظریاتی اختلافات کے باوجود ایسے عناصر جو ہندوستانی ادیبوں کو جوڑتے ہیں وہ زیادہ مضبوط ہیں بنسبت ان کے جو اختلاف پیدا کرتے ہیں۔''

۱۱ر مارچ ۱۹۶۰ء کو نئی دہلی کے آصف علی روڈ پر منشی نکیتن نامی ایک بلڈنگ میں میں نے سجاد ظہیر، غلام ربانی تاباں، شیودان سنگھ چوہان اور شیر جنگ، رفعت سروش وغیرہ کی مدد سے ہندی، اردو اور پنجابی ادیبوں کی ایک میٹنگ بلائی جس کی صدارت شیودان سنگھ چوہان نے کی۔ اس میں ہم

نے دہلی اسٹیٹ پروگریسیو رائٹرس ایسوسی ایشن قائم کی ۔ مجھے (عارف نقوی) اُس کا اتفاق رائے سے جنرل سکریٹری اور ہندی ادیب نول پوری کو اسسٹنٹ سکریٹری چنا گیا۔سجاد ظہیر، غلام ربانی تاباں اور شیو دان سنگھ چوہان، چودھری شیر جنگ اور سریندر بالو پوری کو اس کی مجلس عاملہ میں شامل کیا گیا۔ ہمارے جلسے پابندی سے ہر دوسرے ہفتے ہوتے تھے اور کھل کر افسانوں، مضامین وغیرہ پر بحثیں ہوتی تھیں، جن میں غیر ترقی پسندوں کا بھی استقبال کیا جاتا تھا۔

ایسے جلسوں میں جن لوگوں نے شرکت کی ان میں سے چند نام اس طرح ہیں: احتشام حسین، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، بلونت گارگی، موہن راکیش، امریتا پریتم، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، نیاز حیدر، عادل رشید، ش مظفر پوری، نریندر شرما، نروتم ناگر۔ ہم نے آصف علی روڈ پر رام لیلا گراؤنڈ پر ہزاروں لوگوں کا عالمی مشاعرہ بھی کیا اور ٹاؤن ہال میں کل ہند شب افسانہ جس میں فراق گورکھپوری بھی تشریف لائے۔ اور ۱۲/ سے ۱۸/نومبر ۱۹۶۱ء تک فرقہ واریت، فسطائیت، جنگ اور نسلی امتیاز کے خلاف ایک تصویری نمائش دہلی کے شنکر مارکیٹ میں بھی کی جس کا افتتاح مہاتما گاندھی کے جرمن چیلے ہربرٹ فشر نے کیا۔ انجمن کی پندرہ روزہ نشستوں کے ساتھ ساتھ ہم نے خاص نشستیں بھی کیں۔ مثلاً ۲۸/جنوری ۱۹۶۰ء کو ایک نشست کی صدارت فراق گورکھپوری نے فرمائی۔ انجمن کی بیٹھک میں ساحر، مجروح، مخدوم، تاباں، جان نثار اختر، ملک راج آنند، عصمت چغتائی، سجاد ظہیر، خواجہ احمد عباس وغیرہ نے شرکت کی۔ مارچ ۱۹۶۱ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے عالمی امن کونسل کے اجلاس میں شرکت کرنے والے ادیبوں کے لئے ایک خیر مقدمی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں برطانیہ، سوویت یونین، جرمنی، شری لنکا، امریکہ، جنوبی افریقہ، سائپرس، جاپان، رومانیہ، بلغاریہ، نیوزی لینڈ، پیرو، عراق، یوگوسلاویہ، اور ایران وغیرہ اور ہندوستان کے بہت سے ادیب شامل تھے۔ اور دہلی کے آصف علی رود پر رام لیلا گراؤنڈ میں مشاعرہ کیا گیا جس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔ یہ مشاعرہ بھی میری زندگی کا ایک بہت بڑا ایڈونچر تھا۔ میں نے رام لیلا گراؤنڈ پر مشاعرے کا فیصلہ تو کر لیا تھا، لیکن بہت سے لوگوں کو اس کی کامیابی پر شک تھا۔ چنانچہ عالمی امن کونسل کے صدر پروفیسر برنال اور پنڈت سندر لال وغیرہ مشاعرے سے قبل میرے ساتھ رام لیلا میدان کو دیکھنے کے لئے گئے، کہ وہاں مشاعرہ کامیاب ہو سکے گا یا نہیں۔ کیونکہ سردار جعفری وغیرہ چند لوگوں نے اپنے شک کا اظہار کیا تھا۔ سردار جعفری کے خط مورخہ ۱۸/ مارچ ۶۱ء کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے جو

انہوں نے مجھے لکھا تھا:

''برادر عزیز آپ کا خط ملا۔۔۔بہر حال ہم لوگ آ رہے ہیں۔عباس، بیدی، عصمت، کرشن، مہندر ناتھ، ساحر، مجروح، پرکاش پنڈت وغیرہ۔کوشش کر رہے ہیں کہ ۲۳ر کی شام کو یا ۲۴ر کی صبح کو دہلی پہنچ جائیں۔ ۲۴ر کی شام کو فرنٹیر میل سے یقیناً پہنچ جائیں گے۔۔۔۔۔شبِ افسانہ اور عوامی دور کا مشاعرہ یقیناً کامیاب ہوں گے لیکن مجھے بین الاقوامی مشاعرہ کی ناکامی کا اندیشہ ہے۔ اس لئے کہ رام لیلا گراؤنڈ صحیح جگہ نہیں ہے۔وگیان بھون میں ہونا چاہئے۔کیونکہ غیر ملکی زبانوں میں بھی نظمیں ترجمے کے ساتھ پڑھی جائیں گی۔اس لئے سنجیدہ اور پڑھے لکھے سامعین کا اجتماع ضروری ہے۔یہاں ایک زبان والے ہندوستان ہی کی دوسری زبان پر ہنس دیتے ہیں۔بیرونی زبانوں کو کون سنے گا۔وقت کم ہے پھر بھی اس پر غور کیجئے۔۔۔''

لیکن مجھے خوشی ہے کہ ہزاروں لوگوں کی شرکت کے ساتھ یہ عالمی مشاعرہ رام لیلا گراؤنڈ پر توقع سے کہیں زیادہ کامیاب ہوا اور مجھے سردار جعفری اور بننے بھائی وغیرہ کی شاباشی حاصل ہوئی۔ دوسرے دن ٹاؤن ہال میں سجاد ظہیر کی صدارت میں شام کو شعری اور افسانہ کی محفل منعقد کی گئی جس میں فراق گورکھپوری، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، مخدوم محی الدین، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، جانثار اختر اور امریتا پریتم وغیرہ نے شرکت کی۔ ۲۴ر نومبر ۱۹۶۱ء کی رات کو میں جرمنی میں ڈرامے پر کام کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ سجاد ظہیر، شارب ردولوی، ڈی پی وشست اور ڈرامہ آرٹسٹ ستیو ایر لائنس کی بس میں مجھے ہوائی اڈے پالم پر چھوڑنے کے لئے آئے تھے۔راستے میں سجاد ظہیر مجھ سے سیاست پر گفتگو نہیں کر رہے تھے بلکہ کانٹے چھری سے کھانے کے طریقوں پر۔مقصد یہ کہ ترقی پسند ادیب بھی کوئی چھوئی موئی کا پھول نہیں بلکہ انسان ہوتے ہیں۔

برلن میں بھی مجھے سجاد ظہیر کے جو خطوط ملے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے بانی، بزرگ ادیب اور نقادوں کے سوچنے اور سمجھنے کا طریقہ کیا تھا اور اصلی ترقی پسندی کیا ہے۔اگر کوئی ترقی پسند تحریک کا پڑھا لکھا، سنجیدہ مخالف ہے، تو اسے اس تحریک کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لئے سجاد ظہیر، احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم جیسے دانشوروں کا مطالعہ کرنا چاہئے جو شیلے اور غیر تجربہ کار ادیبوں کا نہیں۔سجاد ظہیر کے خطوط کے اقتباسات: پہلی اپریل ۱۹۶۲ء کو سجاد ظہیر نے مجھے لکھا:

''۔۔۔یہاں اب کی میری غیر موجودگی میں آزاد صاحب نے بڑے گل کھلائے۔اب

ہم نے ان کو علیحدہ کر دیا ہے۔ آئندہ ہفتے سے پرنٹر پبلشر رشید ہوں گے۔ اس زمانے میں تم بہت یاد آئے۔ اگر تم یہاں ہوتے تو ہرگز آزاد صاحب ایسا نہ کر پاتے۔ غلام علی بیچارے اکیلے تھے۔۔۔''

اپنے ۱۴/جولائی ۱۹۶۲ء کے خط میں ماسکو سے انہوں نے دوسری باتوں کے ساتھ مجھے عوامی دور کی مشکلات کے بارے میں لکھا:

''۔۔۔کبھی کبھی جی چاہتا تھا کہ سب چھوڑ چھاڑ کر گھر بیٹھ جاؤں۔ لکھوں۔ پڑھوں۔ گھر والوں کی کچھ سیوا کروں۔ لیکن خودداری نے اسے گوارا نہیں کیا۔ میرے پاس کوئی دو ہزار روپئے بنک میں (لکھنؤ کے) بچی تھے۔ رضیہ سے پوچھے بغیر وہ بھی عوامی دور میں جھونک دئے۔ اس کے بعد جون میں بمبئی گیا کہ دوستوں سے روپیہ جمع کروں۔ ڈھائی ہزار نقد اور چار ہزار کا وعدہ لیا۔ اب جان میں جان آئی۔ امید کرتا ہوں کہ اب حالات بہتر ہو جائیں گے اور سب سے برا وقت گزر گیا۔ اب ایڈیٹوریل سائڈ کو مضبوط کرنا ہے۔۔۔''

۲۸/اپریل ۶۳ء ''عزیزی عارف تمہارا ۱۵/اپریل کا خط ایک ہفتہ ہوا ملا۔۔۔۔ مجھے تم سے بہت توقعات ہیں۔ آخر تو تمہیں لوگوں کو ہمارا بوجھ ہلکا کرنا ہے۔۔۔تم کب وطن واپس آسکو گے۔'' وہ اپنے طویل خط میں آگے لکھتے ہیں: ایمرجنسی کے دنوں میں عوامی دور کی مالی حالت اور اس کی وجہ سے تنظیمی حالت دگرگوں تھی۔ کئی بدخواہوں نے خوشیاں منانی شروع کر دیں کہ اب عوامی دور ختم ہو جائے گا۔ لیکن میں نے کسی طرح پرچے کو جاری رکھا۔ اب ادھر دو مہینے سے حالات بہت بہتر ہیں۔ ہر جمعہ کو شائع ہو جاتا ہے'' (سجاد ظہیر کے خطوط کتاب نامے میں جو عارف نقوی کے نام مشاہیر کے خطوط پر مبنی ہے اور پروفیسر اسلم جمشید پوری نے مرتب کی ہے تفصیل سے پڑھے جا سکتے ہیں۔)

یہ خطوط بھی دکھاتے ہیں کہ کن مشکلات سے ترقی پسند تحریک کو چلانے اور اخبار کو چلانے میں انہیں گزرنا پڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہی بہت سی مشکلات سے غیر ترقی پسندوں کو بھی اگر وہ انسانیت کی نمائندگی کرتے ہیں تو گزرنا پڑا یا پڑتا ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے اہم مقاصد کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر محدود نہ کریں، بلکہ اردو ادب کی بقاء اور فروغ کے لئے اور انسانیت کی بقاء تحفظ اور فلاح کے لئے مل کر قدم اٹھائیں اور صحتمند ادب کو فروغ دیں۔

اتنا بہا ہے خون مرا اس دیار میں گزرا ہوں میں جدھر سے ادھر لالہ زار ہے (عارف نقوی)

☆☆☆

Taraqqi Pasandi : Naye Halaat mein by Arif Naqvi (Berlin, Germnay)
عارف نقوی (برلن، جرمنی) cell-049-151-7068-1386

ترقی پسندی: نئے حالات میں

فتوہ دینے کا حق صرف چند خاص لوگوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ آجکل تو یہ فیشن بن گیا ہے، خاص طور سے دانشوروں اور ان میں بھی نقادوں کے لئے۔ چنانچہ پچھلے کچھ برسوں میں بار بار ادیبوں کی ترقی پسند تحریک کی وفات کے فتوے دئے جا چکے ہیں۔ وہ بھی بغیر حقائق پر غور کئے، بغیر دنیا کے حالات کو دیکھے اور سمجھے۔ بغیر یہ سوچے کہ ترقی پسند تحریک کا جنم اور عروج کیوں، کس لئے، کیسے اور کس پس منظر میں ہوا تھا؟ اگر اس کی اہمیت کو جھٹلایا گیا، اس کی شکل پر پردا ڈالا گیا اور اس کی ساری خوبیوں کو اپنا بتایا کر شان بگھاری گئی تو کیوں اور کیسے؟ کیا وہ مسائل جو ترقی پسند تحریک کا باعث بنے تھے اب ختم ہو گئے ہیں؟ ادیب جن کے سینے میں دردمند دل ہوتا ہے، جو باحس ہوتے ہیں، جو محبت کرتے ہیں، پھولوں کے حسن اور خوشبو میں ڈوب جاتے ہیں اور جب کوئی انھیں روندتا ہے تو تڑپ جاتے ہیں کیا وہ سوچنا ختم کر دیں؟

فتوے دینے والے ہمارے کرم فرما کیا یہ سوچتے ہیں کہ میر غالب اور مجروح کے بعد غزل کا زوال ہو گیا ہے۔ اقبال، فیض اور جعفری کے بعد نظم نہیں ختم ہو گئی ہے اور پریم چند، کرشن چندر اور منٹو کے بعد افسانے کی صنف پر جالا پڑ گیا ہے؟۔ پھر سجاد ظہیر، فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی اور ہمارے جیسے لوگوں کے نہ رہنے سے ترقی پسند تحریک کیسے دم توڑ سکتی ہے۔ جبکہ انسانیت کہ سامنے وہ مسائل اور خطرات آج بھی ہیں جو پہلے تھے اور ادیبوں کے دلوں میں آج بھی دھڑکن ہے، ضمیر میں تڑپ ہے، محسوس کرنے اور سوچنے کی شکتی ہے۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے کہ خونِ دل میں ڈبو لیں ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے ہر ایک حلقہء زنجیر میں زباں میں نے (فیضؔ)

ابھی حال میں مجھ سے کسی نے سوال کیا ہے کہ آپ کی نظریاتی سوچ Ideological thinking کیا ہے؟

سوال بہت اچھا ہے۔ میں جب اپنی ۹۰ برس کی زندگی پر غور کرتا ہوں تو مجھے خود سوچنا پڑتا ہے کہ یہ سوچ کیا تھی اور کیا ہے اور کیوں ہے؟

نظریۂ حیات کو ہم اس طرح محدود نہیں کر سکتے۔ وقت کے ساتھ جتنا ہمارا مشاہدہ اور تجربات بڑھتے جاتے ہیں اتنی ہی ہمارے نظریات میں تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں۔ یا وہ پختہ ہوتے جاتے ہیں۔ مثلاً ابتداء میں ہم مذہب کے دائرے میں سوچتے ہیں اس کے بعد دوسرے نظریات سے متاثر ہوتے ہیں اور ان میں بھی تبدیلیوں اور اصلاح کی ضرورت دیکھتے ہیں۔ جہاں تک ادب یا حیات کا تعلق ہے لوگ مجھے ترقی پسند کہہ سکتے ہیں۔ مجھے اس پر فخر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ترقی پسند ہوں اور روشن خیالی سے انسانیت کی فلاح کے لئے سوچیں۔ لیکن مجھے اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ میں انسان ہوں اور قدرت کے نظام کا حصہ ہوں اس لئے میرے نظریات بھی انسانیت اور قدرت کی فلاح سے نہ بھٹکنے پائیں۔ چنانچہ میں کٹر پنتھی کے بھی سخت خلاف ہوں۔ میں ادب برائے زندگی کا قائل ہوں لیکن روایت اور ادبی قدروں کی بنیاد پر۔ جس طرح کسی کی علمی زندگی میں اس کے خاندانی پس منظر کی بہت اہمیت ہوتی ہے اسی طرح کسی ادیب کی نشونما میں بھی ایسا ہی ہے۔ ۔لفظ ترقی پسندی پر غور کیجئے۔ جیسا کہ ایک بار فیض احمد فیض نے مجھ سے کہا تھا ترقی کی ضد صرف تنزلی ہوسکتی ہے۔ کیا کوئی سچا ادیب تنزلی کو پسند کرے گا؟

ترقی پسندی کے مطلب ہیں ہر چیز میں ترقی اور اسی ضمن میں حسن، اصلاح اور بہتری میں یقین کرنا اور اپنی تحریروں سے اسکے لئے کام کرنا۔ دوسرے الفاظ میں اپنے ادب کو زندگی کے لئے وقف کرنا اور جو چیزیں زندگی کے لئے نقصان دہ ہیں انھیں رد کرنا یا یوں سمجھئے کہ بادسموم کی جگہ باد بہاری کی تمنا کرنا۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی حالات کی تبدیلیوں کو نظر میں رکھنا چاہئے۔ مثلاً جس زمانے میں برصغیر میں ترقی پسند ادیبوں کی تحریک شروع ہوئی تو اس وقت موسمیات کے خطرات کے تصورات واضح نہیں تھے۔ اور ہتھیاروں کی پیداوار کے نقصانات کی بات تو ہم کرتے تھے لیکن وہ اتنے واضح نہیں تھے جتنے آج ہیں اور ان کی وجہ سے دنیا کی بقاء کے سوالات کھڑے ہو گئے ہیں۔ اس کی بھی وجہ ہے۔ پہلے بڑے سامراجی ممالک نو آبادیاتی دیشوں کے زخائر کو آسانی سے لوٹ سکتے تھے اور اپنے صنعتی مال کو کھپا کر ان کی دولت کو لوٹتے تھے یا انہیں قرضدار بنا کر جس طرح چاہتے تھے اپنا الو سیدھا کرتے تھے۔ لیکن اب دوسری جنگ عظیم کے بعد سے بہت سے نو آبادیاتی ممالک آزاد ہو گئے ہیں۔ مغربی سامراج نے نہ صرف انھیں اپنی مٹھی میں رکھنے کی کوشش کی بلکہ یہ دیکھا کہ اگر وہ ان ملکوں

میں وہیں پر مال پیدا کرتے ہیں، تو وہاں کچا مال آسانی سے اور سستا فراہم ہوگا، محنت کش سستے ملیں گے، مال بیچنے میں آسانی ہوگی اور منافع بھی خوب ہوگا اور اپنے ملکوں کے ٹیکسوں سے بچنے کے راستے بھی نکالے جاسکیں گے۔ لیکن اب یہ ممالک اپنا مال خود اپنے محنت کشوں کے ہاتھوں تیار کر رہے ہیں۔ انھیں اب مغرب سے وہ مال منگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ خود مغرب کو وہی مال جو اس کی ٹکنالوجی اور مشینوں اور لاگت کا پھل ہے وہاں سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ نیز اس کے مال کی کھپت کے لئے بازار کی کمی ہے۔ سوائے اس کے راستہ نہیں ہے کہ وہ اپنے خطرناک ہتھیاروں اور اس کی ٹکنالوجی کا ایکسپورٹ کرے اور اس کے لئے اپنے مطلب کے عالمی حالات پیدا کرے۔ چاہے دنیا کا کچھ بھی حشر ہو۔

آجکل ترقی یافتہ ممالک میں دوسرے ممالک کے پچھڑے پن، اصلی جمہوریت کے عنقاء اور تاناشاہیوں کی شکایتیں کی جاتی ہیں۔ حالانکہ وہ خود آتش فشاں پر بیٹھے ہیں اور لاوا کے پھٹنے اور اس کی بھڑکتی ہوئی آگ کا تصور نہیں کر پا رہے ہیں۔ جس طرح ہم کسی بڑے زلزلے کی خطرناکی کو صرف اس وقت محسوس کر پاتے ہیں جب پہاڑ تک ہلنے لگیں اور ہر طرف عمارتیں مسمار ہونے لگیں۔ بہت سے ملکوں میں صرف یہ سوچا جا رہا ہے کہ تاناشاہی اور فسطائیت کا مقابلہ صرف اسے مہلک ثابت کر کے کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے جمہوریت کے نام پر مظاہرے کئے جاتے ہیں اور فسطائیت کے خلاف تحریک چلائی جاتی ہے۔ حالانکہ دوسری طرف ایسے حالات پیدا کردئے جاتے ہیں اور خطرناک ہتھیاروں کی پیداوار پر اور ملکی حفاظت کے نام سے دفاع پر اتنی زیادہ رقمیں خرچ کردی جاتی ہیں کہ تعلیم، صحت اور دیگر سماجی امور کے لئے بجٹ میں رقم کم پڑ جاتی ہے اور ملک میں غیر یقینی صورت حال پیدا ہوجاتی ہے۔ ساتھ ہی دوسرے ممالک اور قوموں سے نفرت اور عالمی تناؤ پھیلایا جاتا ہے جس کا فائدہ رجعت پسند اور فسطائی قوتیں اٹھاتی ہیں اور خطرات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ پھر خطروں کی دہائی دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ سن تیس کے بعد کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جو بدترین فسطائیت کے عروج اور عالمی جنگ کا سبب بنی تھیں۔ جس کے لئے مخدوم محی الدین نے کہا تھا:

''اس بار لڑائی لانے والا بچ کے نہ جانے پائے گا۔''

چنانچہ اس مقام پر بھی ترقی پسند ادیبوں کی یہ بھی ذمے داری ہوتی ہے کہ لوگوں کے شعور کو کریدیں اور انھیں بیدار کریں۔ اور دوسری جنگ عظیم اور جرمنی و دیگر ممالک میں فسطائیت کے عروج اور تباہکاریوں سے انھوں نے جو سبق سیکھے ہیں وہ عام لوگوں اور خصوصاً دانشوروں کو بتائیں۔ تاکہ نئی

تباہکاریاں جو اس بار نیوکلیر ہتھیاروں سے ہوں گی ان کا سد باب کیا جا سکے۔غرضیکہ ہمیں دنیا میں منافع خوری کے طریقوں میں تبدیلی اور محنت کشوں کے طرز زندگی میں تبدیلیوں کی روشنی میں ترقی پسند تحریک میں بھی مناسب تغیرات اور اصلاحات کرنا ہوں گے۔اس میں گھبرانا نہیں چاہئے۔میں سمجھتا ہوں کہ آج ہمیں ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کی پہلے سے بہت زیادہ ضرورت ہے۔آج کسی ایک ملک اور قوم کی بقاء نہیں بلکہ سارے عالم کی بقاء کا سوال سامنے ہے۔لیکن اگر کوئی ترقی پسند ادیب یا ہمدرد کسی کمی یا زیادتی کی طرف اشارہ کرتا ہے تو اس کی اہمیت کو کم نہیں سمجھنا چاہئے۔اس نکتے پر میرا سوچنے کا طریقہ بعض دوسروں سے کچھ مختلف ہے۔ساتھ ہی میں سمجھتا ہوں کہ چاہے جس نام سے یا جس تحریک کے لباس میں کوئی ہمارے سامنے آتا ہے، ہمیں اسے بھی اپنے دامن میں جگہ دینا چاہئے اگر وہ بنیادی طور پر ادب اور انسانیت کو نقصان نہیں پہنچا رہا ہے اور زندی کی قدروں کے خلاف نہیں ہے۔مثلاً اگر کوئی مبہم باتیں کرتا ہے، یا اپنی بات کو گھما پھرا کر کرتا ہے، یا اشاروں سے آگے نہیں بڑھ پاتا تو ہمیں اس کا بھی خیر مقدم کرنا چاہئے، اگر مقصد مثبت ہے۔ساتھ ہی اگر کوئی دوستانہ مشورے دیتا ہے تو ان سے بھی ہمیں اس کو مخالف نہیں سمجھ لینا چاہئے۔چاہے اس کا مشورہ غلط ہی ہو۔ہمیں اس کی نیت کو پہچاننا چاہئے۔ہماری تحریک کے بعض جوشیلے مجاہدوں نے مذہب کو یا کسی اور نظریے کو کٹر پنتھی سمجھ کر اس کی سخت مخالفت کی تھی۔بعض لوگ تو یہ سمجھے تھے کہ مذہب یا دوسرے نظریات کی مخالفت ہی ترقی پسندی کی پہچان ہے۔یہاں تک کہ بعض نوجوان جوشیلے ترقی پسند بال لمبے بڑھا لینے، ڈاڑھیاں رکھ لینے، اپنے گریبان چاک کر لینے، شراب اور سگریٹ کا عادی بن جانے اور مذہب یا دوسرے نظریات کے خلاف باتیں کرنے کو ہی ترقی پسندی سمجھنے لگے تھے۔اور ان میں سے کچھ تو اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ کوئی غیر مارکسی ان کی نظر میں ترقی پسند ہو ہی نہیں سکتا تھا۔حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اگر ہم عوام کے مفاد کی بات کرتے ہیں تو عوام کے حصے اگر اپنی اپنی پسند کے مذاہب، نظریات اور اصولوں کو اپنی زندگی کا حصہ بنائے ہوئے ہیں تو ان میں جو اچھی باتیں ہیں ان کا ہم احترام کریں اور اگر کوئی بات عوام کو نقصان پہنچاتی ہے تو اس کی مخالفت کریں۔ہم انسانوں میں بھی، جن کے لئے ہم اپنی زندگی اور اپنے خیالات وقف کرتے ہیں، خوبیاں اور کمزوریاں پاتے ہیں۔ہم اپنا ادب فرشتوں کے لئے تو پیدا نہیں کرتے ہیں۔ہمارا کہنے کا انداز اور زبان بھی ایسی ہونا چاہئے جو عوام کے قریب ہو جن کے لئے ہم لکھ رہے ہیں۔وہ اسے آسانی سے سمجھ سکیں۔

ان باتوں کو سوچنے کے طریقوں میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں اور سنجیدہ و تجربہ کار لوگوں

اورنوجوان ترقی پسند جوشیلے لوگوں کے بیچ فرق نظر آتا ہے۔سجاد ظہیر، ملک راج آنند،عبدالعلیم، اور احتشام حسین وغیرہ نے کبھی ایسی تنگ نظری نہیں دکھائی تھی۔سجاد ظہیر نے تو حافظ تک پر کتاب لکھی تھی اوراس کی عظمت کا اعتراف کیا تھا۔۔

ترقی پسند ہونے کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہم پرانے فلاسفروں کے پروں پران کی ذہنی پرواز کی منزل کو ڈھونڈھتے رہیں۔ چاہے وہ ارسطو ہوں یا بقراط یا کارل مارکس اوراینگلس یا کوئی خاص مذہب۔ہمیں معاشی اور سماجی رشتوں کو سمجھنا چاہئے۔ وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات کو سمجھنا چاہئے۔مثلاً ہمارے ان فلسفیوں کے وقت میں کمپیوٹر اور موبائیل نہیں تھا۔ٹکنالوجی کی وہ صورت نہیں تھی جو آج ہے۔ناہی ذہنوں میں یہ تصور تھا کہ ہم چاند اور مریخ پر قبضہ کر کے وہاں سے معدنی زخائر حاصل کر سکتے ہیں۔

کارل مارکس نے تاریخ، معاشی رشتوں ،طبقاتی نظام اورعروج، جاگیرداری نظام سے سرمایہ داری اورسرمایہ داری سے سامراجیت کا عروج اوراس کے خطرناک نتائج وغیرہ بہت سی اہم باتوں کے تجزئے کئے تھے۔جن سے ہمیں دنیا کے مسائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔اس نے پرولتاری کا لفظ ایسے مزدور کو دیا تھا جس کے پاس اپنی کوئی ملکیت نہیں ہے۔لیکن آج کم سے کم یورپ میں ہر مزدور کے پاس اپنی کار اور چھٹیوں کے لئے کوئی نہ کوئی کاٹیج ہوتا ہے۔یعنی حالات اور رشتوں میں وقت کے ساتھ تبدیلیا ہورہی ہیں۔دوسری طرف مذاہب میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو قابل قدر ہیں۔جیسے اسلام میں مساوات کا سبق، یارسواللہ، گوتم بدھ اور گورونانک کے اپدیش اور رام کا بن باس کو قبول کر لینا۔لیکن ظاہر ہے کہ ستی جیسی پرانی روایت یا عورتوں کی تعلیم پر پابندی اور مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے خلاف زہر اگلنا۔اس کے خلاف ترقی پسند ادیبوں نے ماضی میں بھی سب سے زیادہ کھل کر لکھا ہے اور آج بھی لکھ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی لکھتے رہیں گے۔ جوان کی ادب کو بھی بہت بڑی دین ہے۔ بلکہ جہاں کہیں انسانوں پر ظلم وستم ہوتا ہے ترقی پسند ادیبوں کے دل تڑپتے ہیں اوران کے قلب اورزبانیں انسانیت کی آوازیں بن جاتی ہیں۔میری نظروں میں تو غالب کا یہ شعر بھی ترقی پسندی کی بہترین مثال ہے:

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

سوال یہ ہے کہ اس شعر کو پڑھنے یا سننے کے بعد ہم کس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

یا میر تقی میر کا قطعہ:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا ناگہ وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھی کسو کا سر پر غرور تھا

میں تو کہوں گا کہ آل انڈیا پروگریسیو رائٹرس ایسوسی ایشن کا جو ڈرافٹ مینی فیسٹو تیار کیا گیا تھا، جس میں بعد میں کچھ ترمیم کی گئی تھی اس میں ایک بار پھر آج کا حالات میں ترمیموں کی ضرورت ہے۔ جو میرے خیال سے مندرجہ ذیل ہونا چاہئیں:

انجمن ترقی پسند مصنفین کا نیا ڈرافٹ مینی فیسٹو: عارف نقوی کی تجویز:

''۱۔ پروگریسیو رائٹرس ایسوسی ایشن یہ ضروری سمجھتی ہے کہ انسانیت کی بقاء اور فروغ کے لئے اس کے مینی فیسٹو، مقاصد اور لائحہ عمل کو ایک بار پھر وضاحت کے ساتھ تیار کیا جائے۔

۲۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک انسانیت کی بقاء اور فلاح کے لئے، دنیا کو خوبصورت بنانے کے لئے اور سماج کے سبھی طبقوں کے لوگوں کی زندگی کو خوشنما بنانے کے لئے ادیبوں میں شعور جگائے گی اور زندگی کو نقصانات پہنچانے والے عناصر اور ان کی تخریبی کاروائیوں کی مخالفت کرے گی۔ اور ایسے ادب سے پرہیز کرے گی جو لوگوں میں مایوسی، پس ہمتی اور تخریبی جذبات کو پھیلائے۔

۳۔ ادیبوں کی ترقی پسند تحریک نہ کوئی سیاسی تحریک ہے، نہ مذہبی، نا ہی تجارتی۔ یہ صرف ایک ادبی تحریک ہے جس کا مقصد صحتمند اور انسانیت پسند ادب کو فروغ دینا ہے۔

۴۔ آج کے بدلے ہوے حالات میں اپنے ملک کی معیشت کو ترقی دینے اور سماج کے ہر طبقے اور فرقے کے فروغ اور ترقی کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں اور اس سلسلے میں لوگوں کے شعور کو بیدار کریں گے۔

۴۔ غریبی، بے روزگاری اور جہالت کو دور کرنا اور علم و ہنر اور روشن خیالی کو فروغ دینے میں ادیبوں کے تعاون کو اہمیت دیتی ہے۔

۵۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دانشوروں کو، چاہئے کہ ان کے نظریات اور اعتقادات کچھ بھی ہوں وہ مل کر انسانیت، باہمی احترام اور محبت، حب الوطنی، ملک کی آزادی، ترقی، اپنے ملک، خطے اور دنیا کے امن وامان کے لئے اپنی تحریروں اور فن کا استعمال کریں گے اور نوآبادیاتی نظام، زرگری، اسلحہ بندی کی دوڑ اور ماحولیات کو اور خراب کرنے والی باتوں کی مخالفت کریں گے۔

۶۔ ہماری رائے میں ہر ترقی پسند ادیب کو لوگوں میں رنگ و نسل کے فرق کی بنیاد پر امتیاز، مذہبی تعصب اور تنگ نظری کی مخالفت کرنا چاہئے اور انسانوں کے رشتوں کو خوش گوار بنانے کے لئے اپنے

قلم کا استعمال کرنا چاہئے۔

۷۔ترقی پسند ادیبوں کی تحریک توقع کرتی ہے کہ ادیبوں کی تخلیقات معیاری، تہذیبی اور فن وحسن کے دائرے میں ہوں گی۔

۸۔ہم ادب اور ادیبوں کے تحفظ، احترام، آزادیٔ خیال اور آزادیٔ نقل وحمل کی اہمیت پر بھی زور دیتے ہیں۔

۹۔ہم ملک اور بیرونِ ملک کے ادیبوں کے ساتھ تعلقات، تبادلۂ خیالات، ادب پاروں کے تبادلہ اور آزادانہ ملاقاتوں کو عالمی ادب کے فروغ اور عالمی ماحول کو بہتر بنانے کے لئے اہم وسیلہ سمجھتے ہیں۔

۱۰۔ہم سمجھتے ہیں کہ مختلف زبانوں کا ادب ایک دوسرے سے بہت کچھ حاصل کرسکتا ہے۔ چنانچہ ہم سبھی زبانوں کے فروغ کے لئے باہمی تعاون کو اہمیت دیتے ہیں۔

۱۱۔ہم اپنی ترقی پسند ادبی تحریک میں ہر چھوٹے، بڑے ادیب کے مشوروں اور تنقیدوں پر سنجیدگی سے غور کریں گے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گی۔

۱۲۔ہم انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہر رکن کا استقبال کرتے ہیں۔لیکن غیر ممبروں اور ہمدردوں کا بھی۔

ترقی پسند ہونے کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ کوئی ادیب ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا رکن ہو۔ ہماری نظر میں ہر وہ ادیب ترقی پسند ہے جو انسانیت کی فلاح اور ترقی کے لئے ادب کی تخلیق کرتا ہے دلوں کو وسیع، حوصلہ مند، اور دردمند اور روشن خیال بناتا ہے۔

یہ سارا ڈرافٹ میں نے اکیلے تیار کیا ہے۔ جو میں چلتے وقت نئی نسل کو دینا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ سبھی دوست اور کرم فرما حضرات جنھیں انسانیت کی کچھ بھی فکر ہے اسے اپنی اصلاحات سے مکمل کریں گے اور ادیبوں کی نئی نسل کو سونپیں گے۔

☆☆☆

Urdu Zaban-o-Adab ka Mukhlis Dost : Dr. Shahab Zafar Azmi

by Dr. Mohd. Zameer Raza (Dept. of Urdu, Patna University, Patna)
ڈاکٹر محمد ضمیر رضا (شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ)

اردو زبان وادب کا مخلص دوست: شہاب ظفر اعظمی

ایک وہ دور تھا جب، الطاف حسین حالی، امداد امام اثر، قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد اور وہاب اشرفی جیسی بڑی اور عظیم شخصیتیں اردو تنقید و تحقیق کے میدان کی آبیاری کر رہی تھیں۔ جن کے نظریات و افکار اور ادبی کاوشیں آج بھی سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہمہ وقت ادب میں کچھ نیا اور نتیجہ خیز امر کی انکی کوششیں منظر پر آتی رہیں۔ لیکن آج وہ ہمارے بیچ نہیں ہیں مگر ان کی تحریرین روشنی دے رہی ہیں اور ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔ تاہم ادب میں کچھ نیا کرنے کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ موجودہ دور میں بھی بہت سی ایسی نامور ہستیاں موجود ہیں جو اپنی قیمتی اور علمی تحریروں سے ادب کے دامن کو مالا مال کر رہی ہیں۔ فن کو بالیدگی بخشنے کے ساتھ ساتھ اسے وسعت دے رہی ہیں۔ یہ عمل دو صورتوں میں دیکھا جاتا ہے ایک درس و تدریس کے حوالے سے اور دوسرا علمی و ادبی تخلیقات کی بنیاد پر۔ دونوں فریضے ایک معلم ایک ادیب اور ایک فنکار کے لئے سماجی فلاح و بہبود کی ضمانت ہیں۔ جن کے عمل سے روح کو آسودگی تو فراہم ہوتی ہی ہے ساتھ ہی نو واردان ادب میں نئی فکر اور جوش بھی پیدا ہوتا ہے۔ انہیں نیک متحرک اور فعال ادبا میں ایک نام ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا ہے۔ جو شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں ایسوسیٹ پروفیسر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جن کی شخصیت کا نقش اگر لفظوں سے بنایا جائے تو شاید الفاظ اپنا حق ادا نہ کر سکیں مگر میں پورے یقین سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر اپنے ضمیر کی آواز کو سن کر ان کے اخلاقی پہلو کی تصویر اتاری جائے تو دل کے ساتھ ذہن روشن ہو اور خوشبو کی طرح مہک اٹھے۔ اور دل کے نہاں خانوں سے صدا آئے کہ گفتار ہو تو ایسی کردار ہو تو ایسا۔

۲۰۰۳ء میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے منتخب ہونے والے خوش نصیب اساتذہ میں شہاب ظفر اعظمی بھی تھے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں خوشی مل رہی ہے کہ مجھے ان کی شاگردی کا شرف

حاصل ہے۔ میں یہ بتا تا چلوں کہ میرے ایم اے اردو کے داخلے کا سال بھی وہی ہے جو استاد محترم کے جوائن کرنے کا سال ہے۔ اس اعتبار سے میں نے اپنے ایم اے کے دونوں سال ان کی شاگردی میں گزارے ہیں اور سینکڑوں کلاسز میں شریک ہو کر ان سے علمی معلومات سے فیض حاصل کیا ہے۔ دوسرا اسی شعبے سے اردو جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن کے کورس کا جب آغاز ہوا تو اس کورس کے پہلے بیچ کا طالب علم میں بھی بنا اور پھر سے ایک بار ان کی زیر سرپستی یعنی بطور کورس کوآرڈینیٹر ان کی رہنمائی حاصل ہوئی۔ گویا کہ استاد کی شفقت کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ اور یہی وہ تعلیم و تربیت کا خوبصورت دور تھا جس کا نقش ایسا دل و دماغ پر چھایا کہ استاد کی اہمیت کا احساس ہمیشہ کے لئے قائم و دائم ہو گیا۔ جس کی گواہ آج یہ میری ٹوٹی پھوٹی تحریر ہے جس کے ذریعہ میرے جذبات باہر نکل کر جملے میں مبدل ہو رہے ہیں۔

آج کا دور بہت تیز رفتار ہے۔ ہر انسان خود میں گم ہے یا پھر گردش شام و سحر میں خود کو مستحکم بنانے کے لئے جد و جہد میں مصروف ہے۔ خواہشوں کے دام میں ہر کوئی الجھا ہوا ہے۔ ایسے میں فنون لطیفہ میں شامل ادب کچھ راحت و سکون کے لمحات میسر کرانے میں آج بھی کامیاب ہے۔ شرط یہ ہے کہ ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے وقت نکالا جائے جبکہ وقت کی کمی آج سب کے لئے ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ایسے میں کچھ نیا کارنامہ انجام دینا اور نئی فکر کو راہ دینا واقعی غیر معمولی عمل ہے۔ اور ان پر عمل پیرا ہونا دشوار کن۔ مگر ان کو بھی سہل بنانا ایک قابل استاد کی پہچان ہے۔ وقت کا کیسے مثبت استعمال ہو ایک اعلی استاد کے علاوہ کون جان سکتا ہے۔ اور یہی تمام فرائض اور علمی و عملی کاوشیں استاد اپنے شاگرد میں بھی تلاش کرتے ہیں۔ تو ہمیں یہ کہنے دیجئے کہ استاد کا حق ادا کرنا ہے تو استاد کے طریقہ کار پر عمل پیرا ہو کر معاشرے کے لئے بہتر انسان بن جانا ضروری ہے اور اسی میں استاد کی خوشی مضمر ہے۔ اس سے شاید ایک بہتر شاگرد ہونے کا حق ادا ہو جائے۔ بہت قسمت سے ایسے استاد کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ جی ہاں شہاب ظفر اعظمی کی استاذی کا صرف میں ہی قائل نہیں ہوں بلکہ مجھ جیسے طلبا کی ایک لمبی فہرست ہے۔ جن مین شامل شاگردان ان کی علمی بصیرت اور نیک مشوروں سے فیض اٹھا کر کامیابی کی بلندی پر پہنچ رہے ہیں۔ بہار ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے دیگر شہروں میں مختلف مقامات پر ان کے شاگرد اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور یہ کہتے نہیں تھکتے کہ سر کی وجہ سے ہمیں لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر بولنا آ گیا ہے۔ ان کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتے رہنے سے شخصیت میں بلندی آئی ہے۔ اب ہر وہ کام آسان سا لگنے لگا ہے جو کبھی ناممکن معلوم

ہوتا تھا۔کبھی مائک پر بولتے ہوئے پاؤں تھرتھراتے تھے‘الفاظ بکھرے بکھرے سے ادا ہوتے تھےلیکن شعبہ اردو کی جاندار اور شاندار ادبی محفلوں نے ان ساری رکاوٹوں کو دور کر دیا۔اور بلا شبہ ان سب کے پیچھے ہمارے محترم استاد شہاب ظفر اعظمی کی محنت اور محبت کارفرما رہی ہے۔ یہ تمام مداح آج اپنی ہر کامیابی کا سہرا انہیں کے سر باندھتے ہیں۔ ۲۲ سال کی طویل مدت میں نہ جانے کتنے طالب علم کامیاب ہوکر مختلف شعبے میں اپنی ذمہ داریوں کو نبھا رہے ہیں۔طلبا کی یہ کامیابی جتنی ان کی ہے اس سے کہیں زیادہ استاد کی ہے۔ چونکہ تمام طلبا کی کامیابی اور کامرانی کی بساط یوں ہی نہیں بچھائی گئی ہے بلکہ اس میں ایک نیک دل مخلص مشفق استاد کی روشن خیالی‘ ترقی پسند طبیعت‘ عمدہ اخلاق‘ محنت شاقہ اور جانفشانی کے روشن چراغ کی تیز لو شامل ہے جو ہر اس شخص کے لئے برابر اجالے دے رہی ہے جسے اردو زبان و ادب سے والہانہ محبت ہو‘ جو مساواتی نظریہ کا قائل ہو اور جو شعر و ادب سے شغف رکھتا ہو۔انہوں نے علم کا ایسا چراغ جلایا کہ ظلمت کہیں دور صحرا میں اپنی جبیں گھستی دکھائی دینے لگی۔

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

اس علمی چراغ کی لو نہ کبھی مدھم ہوئی اور نہ زمانے کے کسی منفی رویئے سے بجھ سکی۔بقول کلیم عاجز:

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ رستے میں خواہ دوست کہ دشمن کا گھر ملے

ایسے سرگرم اور متحرک استاد کی مصروف زندگی کے شب و روز کے مشکلات کا اگر ذرہ برابر بھی اندازہ لگایا جائے تو کئی حیرت کن نتائج سامنے آئیں گے۔یعنی خود کی زندگی کے آرام و آسائش سے بےتوجہی برتتے ہوئے ادب اور ادبی کاموں میں بلا کی دلچسپی ان کا اولین فریضہ ہے۔شعبے کی ترقی‘ طلبا کی کامیابی‘ تحقیقی کام میں عمدہ پن‘ سیمینار‘ طلبا کو فعال اور متحرک بنانے کے لئے مختلف نوعیت کے پروگرام کا انعقاد کر کے انہیں اظہار خیال کرنے کے مواقع فراہم کرنا‘ اردو جرنل کی مسلسل اشاعت ان سبھی کاموں کے پیچھے کی محنت اور تیاریوں کا محاسبہ کیا جائے تو ایک ہی نام گونجتا ہوا سنائی دیتا ہے اور وہ نام شہاب ظفر اعظمی کا ہے۔عین ممکن ہے کہ میری اس تحریر کو جو صرف میرے محسوسات اور جذبات ہیں جو حقیقت پر مبنی اور مبالغہ سے پاک ہیں‘ پڑھ کر سبھی متفق نہ ہوں مگر مجھے کہہ لینے دیجئے کہ ابھی کچھ ہی مہینے قبل بہار کے وزیر اعلی کے ہاتھوں پٹنہ یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں جب استاد محترم کو بیسٹ ٹیچر کا ایوارڈ ملا تو ادبی حلقے میں خوشی کی لہر دوڑ پڑی۔مختلف ادبی تنظیموں نے آپ کی شان میں اعزازیہ پروگرام منعقد کئے ناچیز کو بھی ان محفلوں میں شریک ہونے اور تاثرات بیان کرنے کا موقع ملا۔اس موقع پر میں نے ایک شعر کہا تھا۔

ہر سمت سے صدا ہے مبارک ہو یہ گھڑی م ہے ناز سب کو آپ پر استاد اعظمی

مجھے یقین ہے کہ اس شعر کی اہمیت کسی ایک اعزاز کے لئے نہیں ہے بلکہ ان کے سراپا عمدہ کردار اور اعلی اخلاق کے لئے ہے۔ سچے استاد اپنے درس و تدریس کے فرائض کے علاوہ دیگر مصروفیات میں سرگرم عمل رہنے میں قلبی آسودگی محسوس کرتے ہیں۔ یہ بات تخلیقیت کے اعتبار سے زیادہ حقیقت پر مبنی ہے۔ یعنی ہمہ وقت کچھ لکھتے رہنا۔ اس حوالے سے میں عرض کرتا چلوں کہ درجنوں کتابوں کی تخلیق کے علاوہ رسالوں میں مسلسل شائع ہوتے رہنا بھی ایک متحرک استاد کی پہچان ہے۔ اس ضمن میں جو میں نے محسوس کیا ہے وہ یہ کہ بعض اوقات ایسا ہوا کہ استاد محترم کا کسی مہینے کے شروعات میں کوئی تنقیدی مضمون شائع ہوا اس مضمون کے مطالعے کے ساتھ یہ خیال بھی ہوا کہ اب اس کے بعد سر کا کون سا مضمون کب آئے گا پتا نہیں۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ ابھی اس مضمون کی اثر انگیزی سے باہر بھی نہیں نکلے کہ کسی دوسرے ادبی رسالے میں کوئی نیا اور تازہ مضمون زینت بن کر روشن ہو گیا۔ یہ تخلیقی قوت اور ادب نوازی کا جذبہ ہم جیسے نہ جانے کتنے قارئین کے لئے کسی قیمتی تحفے سے کم نہیں۔ بلکہ ہمیں متحرک کرنے میں حد درجہ معاون ہے۔ خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ ان کی کئی کتابیں ایم اے کے نصاب میں شامل ہیں۔ بلا شبہ استاد کی تحریریں ایک شاگرد کی نظر میں محترم و معتبر ہونے کے ساتھ ہر گام پر رہنمائی کرتی رہتی ہیں۔ یہاں پر ایک بات کا خیال مجھے بار بار آ رہا ہے کہ ان تخلیقی مرحلوں سے گزرنے اور ان کی اشاعت میں جو مشقتیں استاد کی جانب سے اٹھانی پڑتی ہیں اس کا بھی احساس اور اس کی پذیرائی ہونی چاہئے۔ چونکہ ادب کی تخلیق میں تنقیدی عمل کے ذریعے کسی نتیجہ خیز فیصلے پر پہنچنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس اعتبار سے اس میدان میں دلجمعی اور یکسوئی کی کارفرمائی کو اہمیت حاصل ہے۔ تاکہ خیالات و نظریات جب شائع ہو کر عام ہو جائیں تو کسی طرح کا تنازعہ نہ پیدا ہو۔ اس کے لئے مثبت ماحول اور عمیق مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذہن میں خیال کو ترتیب دینے کے ساتھ حقائق سے مکمل طور پر روشناس ہونا پڑتا ہے۔ الفاظ کی معنویت کے ساتھ اس کی صوتیات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ لہذا تخلیقیت کا یہ سفر بالکل آسان نہیں ہوتا ہے۔ ایسے میں استاد محترم کی کوئی تخلیقی کاوش ہمارے روبرو ہوتی ہے تو فرط مسرت کے ساتھ ایک طرح کے اپنا پن کا احساس بھی ہوتا ہے۔ دل کرتا ہے کہ تمام تحریروں کو اپنے حافظے میں رکھ لیں۔ یہ بات بہ بانگ دہل کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی شخصیت انسان دوستی اور خلق و مروت کی عظیم صفات سے مزین ہے، جس میں تصنع اور دکھاوا پن کا شائبہ تک نہیں ہے۔ طبیعت میں ٹھہراؤ، متانت اور سنجیدگی ان

کی شخصیت سے صاف طور سے جھلکتی ہے۔منکسر المزاجی، اخوت اور خاکساری جوان کی گفتگو سے بیاں ہوتی ہے وہ فطری پن سے بھری ہوتی ہے۔طلبا کے سیکڑوں سوالوں اور پریشانیوں کو اپنی ذہنی اور علمی صلاحیت سے حل کرنا ان کا روزمرہ کا معمول ہے۔تحریری اصلاح کے کام میں کبھی بھی کسی طالب علم کے لئے ان کے یہاں حرف انکار نہیں دیکھا گیا۔ بلکہ جو جتنی بار اصلاح لینا چاہے اس کا ہر بار استقبال ہے۔ نیک مشورے نیک خواہشات اور اپنے طلبا کے لئے بے شمار دعائیں دینا ان کے اولین فریضے میں شامل ہے۔اور ان سب کی جھلک ان کی تحریروں میں بھی صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔یعنی اپنے موضوع کے تئیں انصاف پسندی اور دیانت داری سے کام لینا ان کا مشغلہ ہے۔کل ملا کر جیسی ان کی شخصیت ہے ویسی ہی ان کی تحریریں بھی ہوتی ہیں جو نہایت سہل اور اپنے موضوع سے انصاف کرتی ہوئی رواں اور معلوماتی ہوتی ہیں۔اسلوب و بیان کی تروتازگی بھی ذہن و دل میں کسی پیچیدگی کو راہ نہیں دیتی بلکہ ذہن و دل بار بار ان کے مطالعہ کا تقاضہ کرتے ہیں۔ایک درجن کتابوں کے خالق اور بے شمار مضامین لکھ کر اپنی پہچان بنا چکے شہاب ظفر اعظمی کے تقریباً ڈیڑھ درجن ریسرچ اسکالرز ہیں ۔لیکن ہمت ایسی کہ اب بھی اسی توانائی سے لکھنا پڑھنا جاری ہے۔سیمینار کے حوالے سے دور دراز کا سفر بھی آسانی سے طئے کر کے اپنی شمولیت درج کرانا ان کا شوق ہے۔کشمیر ہو یا کولکاتہ یا پھر سابیتہ اکاڈمی دہلی ہر جگہ اپنی تقریروں اور مقالات اور ادبی گفتگو میں سرگرم رہتے ہیں۔ایسے قلم کے غازی اور ادب سے والہانہ محبت رکھنے والے استاد معاشرے اور ملت کے لئے ایک آئیڈیل کی شکل میں ہوتے ہیں۔شہاب ظفر اعظمی کی شخصیت پر نگاہ ڈالنے سے اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ سے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ کبھی نہ تھکنا ہے اور کبھی نہ رکنا ہے بلکہ مسلسل آگے بڑھتے جانا ہے۔ راہ چاہے کتنی بھی دشوار کن ہو حق کے راستے سے پاؤں کبھی لڑکھڑائے نہیں۔ کیوں کہ ادبی تعلیمات کے علاوہ ان کی اسلامی تعلیمات بھی اس بات کا احساس کراتی ہیں کہ ذمہ داریوں کا احساس عبادت ہے۔اور اس عبادت میں سرور ہے، مستی ہے، نشہ ہے اور بہت کچھ ہے۔تعصب پسندی ان کے آس پاس کبھی کھڑی بھی نہیں ہو سکتی ہے۔ایسے میں ہم سبھی تلامذہ کی یہ نیک ذمہ داری بنتی ہے کہ ایسے استاد کی صحت اور سلامتی کی ہمیشہ دعا کرتے رہیں۔تاکہ ہم سب ان کی علمی نگارشات کے ساتھ ساتھ ان کے نیک مشوروں کو اپنی زندگی کا شعار بنا سکیں۔مختصر یہ کہ شہاب ظفر اعظمی کے علمی و ادبی مضامین ہندوستان اور ہندوستان کے باہر معروف ادبی رسائل میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہتے ہیں۔جس سے ان کی شخصیت کے مختلف النوع جہات کا انہیں بھی اندازہ ہوتا ہے جو ان کے قریب نہیں

ہیں اور جو قریب ہیں وہ ان کے فیضان سے اس قدر متاثر ہیں کہ اپنی قسمت پہ نازاں ہیں۔ان باتوں کا ذکر اس لئے بھی ضروری ہے کہ علم وادب کے سفر میں ہمیں سب سے زیادہ اپنے استاد کے کارنامے ہی متاثر کرتے ہیں۔لہذا استاد کی قدر و قیمت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ان کے کارنامے ہمہ وقت پیش نظر ہوں تو مجھے کامل یقین ہے کہ زندگی کا کوئی بھی کام ادھورا نہیں ہوسکتا۔ہم اپنے مشفق استاد کی صحت وسلامتی کے لئے رب کائنات سے دعا گو ہیں۔

احساس محبت سے دل جس کا منور ہو　　استاد کے پیروں میں خورشید نظر آئے

☆☆☆

Sharib Rudaulvi ki Tasaanif ka Ijmaali Jaeza by Nasiba Khatoon
(Research Scholar, dept. of Urdu, Kazi Nazrul University, Asansol)
نصیبہ خاتون (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، قاضی نذرل یونیورسٹی، آسنسول)

شارب ردولوی کی تصانیف کا اجمالی جائزہ

شارب ردولوی ہمارے دور کے ایک مایہ ناز ادیب ،شاعر اورنقاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ان کی پیدائش ۱۲/ مارچ ۱۹۳۲ء کو ردولی، اتر پردیش کے تعلیم یافتہ زمیندار گھرانے میں ہوئی۔بچپن سے انھیں مذہبی وادبی ماحول میسر ہوا۔ان کے دادا حکیم غلام حسنین کے پاس علمی وادبی کتابوں کی بہتات تھی اور والد حسن عباس مولوی تھے،جس کی وجہ سے انھیں بچپن سے ہی کتابوں سے رغبت ہوگئی اور گھر کے اسی علمی ماحول اور کتابوں کے مطالعہ نے ان کے مطالعۂ شوق کو پروان چڑھانے میں مدد کی۔شارب ردولوی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا لیکن جلد ہی تنقید نگاری سے وابستہ ہوگئے اور اردو ادب میں بحیثیت ناقد زیادہ مشہور ہوئے۔انہوں نے ابتدائی تعلیم مخدومیہ اسکول سے حاصل کی۔بی۔اے،ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی لکھنؤ یونیورسٹی سے مکمل کیا اور پھر دہلی یونیورسٹی کے دیال سنگھ کالج میں بحیثیت لکچرر مقرر ہوئے۔ان کے ادبی سفر کا باضابطہ آغاز لکھنؤ یونیورسٹی سے ہوا حالانکہ اس سے پہلے وہ شاعری کی دنیا میں قدم رکھ چکے تھے۔انھوں نے اپنا پہلا مضمون روزنامہ ''سیاست'' کانپور سے شائع کیا۔اس کے بعد ان کی غزلیں، نظمیں اور مضمون متعدد ادبی رسائل میں شائع ہونے لگے۔انھوں نے اپنی زندگی کی دشواریوں کو کبھی اپنے اوپر حاوی نہیں کیا۔اردو ادب سے محبت اور علمی شغف کی وجہ سے ان کا قلم مسلسل چلتا رہا۔یہی وجہ ہے کہ آج اردو ادب ان کی تخلیقات سے مالا مال ہے۔

شارب ردولوی کی تصانیف کے نام ''مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر''، ''گلِ صد رنگ''، ''افکار سودا''، ''جگر فن اور شخصیت''، ''مطالعۂ ولی''، ''تنقیدی مطالعے''، ''اردو مرثیہ''، ''آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید، انتخاب غزلیات سودا، معاصر اردو تنقید مسائل ومیلانات''، ''تنقیدی مباحث''، ''جدید اردو تنقید اصول ونظریات''، ''اردو مرثیہ کی ادبی اہمیت''، ''ترقی پسند شعری فکر اور اردو شعراء

''، ''تنقیدی عمل''، ''اسرارالحق مجاز''، ''مرثیہ اور مرثیہ نگار'' وغیرہ ہیں۔

ان کی پہلی تصنیف '' مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر'' ہے جو ۱۹۵۹ء میں منظر عام پر آئی۔اس کا انتساب شارب ردولوی نے اپنی اماں مرحومہ کے نام کیا ہے جو ان کی کم عمری میں ہی دنیا ئے فانی سے رخصت ہوگئی تھی۔اس کتاب کا مقدمہ پروفیسر احتشام حسین نے لکھا۔یوں تو میر انیس اور مرثیہ نگاری کے متعلق دیگر کتابیں دیگر مصنفوں نے تحریر کیں لیکن شارب ردولوی نے ان سب لوگوں سے ہٹ کر انیس کے مرثیوں میں ڈراما کے عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی جو ایک اچھوتا موضوع ہے۔اس کتاب میں ڈراما اور مرثیہ کی تعریف، مرثیے کا آغاز اور ارتقا، مرثیے کی ہیئت، مرثیے کے اجزائے ترکیبی شامل ہیں۔آخر میں ڈرامائی عناصر مثلاً کشمکس، تصادم اور عمل کو انیس کے مرثیے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کی دلیل بھی پیش کی گئی ہے۔شارب ردولوی نے اس کتاب میں واضح طور سے کہا ہے کہ انیس کے مرثیے بظاہر ڈرامے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے لیکن انیس کے مرثیے کے مطالعے کے دوران ڈرامائی عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں کیوں کہ میر انیس نے روایتی مرثیہ نگاری سے ہٹ کر مرثیہ لکھا اور اس میں بہت سی چیزوں کا اضافہ بھی کیا۔کتاب کے مقدمہ میں سید احتشام حسین شارب ردولوی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عزیزی شارب ردولوی کی یہ پہلی ادبی کوشش ہے اور مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے شروع ہی میں ایک سنجیدہ اور فکر انگیز موضوع پہ قلم اٹھایا ہے۔جب انھیں اپنے خیال و بیان پر اور قدرت حاصل ہوجائے گی اسوقت مجھے امید ہی نہیں یقین بھی ہے کہ وہ نقد ادب کے دوسرے پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں اور کامیاب ہوں گے۔اپنے تنقیدی موضوعات پر لکھنے کے لئے مطالعہ، ذوق، لگن اور سنجیدگی کی ضرورت ہے اور شارب میں یہ باتیں موجود ہیں انھیں مطالعہ کا شوق ہے، انکا ذوق سلیم اور مزاج سنجیدہ ہے اگر زمانے نے انھیں موقع دیا تو یقیناً وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکیں گے اس پہلی تصنیف کے لئے میری دعا ہے کہ مقبول ہو۔''

(مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر، پروفیسر شارب ردولوی،ص:۸)

''گلِ صد رنگ'' شارب ردولوی کی دوسری کتاب ہے جس کی اشاعت ۱۹۴۱ء میں ہوئی۔انھوں نے اپنی اس ادبی کاوش کو جناب مقبول احمد لاری کے نام کیا ہے۔اس کتاب میں انھوں نے اردو کے ۲۸۷ منفرد غزل گو شعراء کی غزلوں کا انتخاب کیا ہے اور ان شعراء کی دو دو غزلوں کو اس کتاب میں جگہ دی ہے۔ان شعراء میں اثر لکھنوی، آزاد جگن ناتھ، احتشام حسین رضوی، اختر

اور ینوی، اختر انصاری، اعجاز صدیقی وغیرہ شامل ہیں۔ان شعراء کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بھولے افسانے وفا کی یاد دلواتے ہوئے تم تو آئے اور دل کی آگ بھڑکاتے ہوئے

(اثر لکھنوی)

دامن کی ہوا یاد نہ زلفوں کی گھٹا یاد اب کچھ بھی نہیں سوزِ غم دل کے سوا یاد

(آزاد جگن ناتھ)

''افکار سودا'' شارب ردولوی نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا۔اس کتاب کی اہمیت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ جس وقت انہوں نے اس کتاب کو لکھا اس وقت سودا کے کلام کو یکجا کرنا ہی بڑا مشکل کام تھا ۔اس کتاب سے سب سے زیادہ فائدہ اس وقت کے طلباء کو ہوا۔جب اس کتاب کا پہلا ایڈیشن آیا تو قارئین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔اس کے بعد شارب ردولوی نے اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔اس کتاب کے ذریعہ سودا کے زمانے کے سماجی و سیاسی حالات سے واقفیت ہوتی ہے اور یہ حالات سودا پر کس طرح اثر انداز ہوئے واضح ہو جاتے ہیں۔اس کتاب کے علاوہ انہوں نے ''انتخاب غزلیات سودا'' کتاب بھی لکھا جو ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی یہ کتاب دو حصوں میں مشتمل ہے پہلے حصے میں سودا کی سوانح اور شاعری ہیں، دوسرے حصے میں سودا کی غزلیات کا انتخاب ہے۔

''جگر فن اور شخصیت'' یہ کتاب ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔جگر مرادآبادی کا نام اردو کے اہم شعراء میں شمار کیا جاتا ہے۔اردو غزل کے عناصر اربعہ میں ایک نام جگر مرادآبادی کا بھی ہے۔ان کی غزلوں کے موضوعات عشق و عاشقی پر مبنی ہیں۔جگر کے تمام فنی خصوصیات اس کتاب میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہیں۔پہلے حصے میں جگر کی شخصیت کو واضح کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں اردو غزل کے جائزے کے ساتھ جگر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔شارب ردولوی اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''جگر صاحب کی شاعری میں کئی عبوری دور آئے جس کے باقاعدہ مطالعے کیلئے اس زمانے کے تفصیلی حالات کا جاننا بیحد ضروری تھا اس لئے میں نے انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے سیاسی، تاریخی اور تہذیبی حالات کا مکمل جائزہ پیش کر دیا ہے تاکہ اس کی روشنی میں ان کے ذہنی ارتقاء کا مطالعہ ہو سکے اور ان کے شاعرانہ مقام کے تعین میں مدد مل سکے ان کے فن پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے میں نے ان کی شاعرانہ زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے پہلا دور ''داغِ جگر'' سے ''شعلۂ طور'' تک اور دوسرا دور ''آتش گل'' کے کلام تک ہے۔'' (جگر فن اور شخصیت، شارب ردولوی، ص:۹)

''مطالعہ ولی'' ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ ولی کے متعلق یہ جامع کتاب انہوں نے دہلی سے لکھا۔ جب وہ بچوں کو دہلی میں پڑھایا کرتے تو ولی کے متعلق مواد کی فراہمی میں انھیں کافی دشواری ہوتی۔ اسی وجہ سے انہوں نے ولی کا مطالعہ کر کے ''مطالعہ ولی'' تحریر کیا اس کتاب میں ولی کی حالات زندگی، دکن کا سیاسی وتہذیبی پس منظر، ولی کی صوفیانہ شاعری اور ان کا فن، ان کی زبان اور ان کے کلام کا انتخاب ملتا ہے اس عہد کے سبھی ناقدین نے اس کتاب کو بے حد سراہا۔ ''کلیات ولی'' کے مرتب پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے شارب ردولوی کے متعلق لکھا ہے کہ:

''شارب ردولوی خود بہت سلجھا ہوا مذاقِ سخن رکھتے ہیں ان کی یہ تالیف ان کے ذوقِ سلیم کی بھی آئینہ دار ہے ان کے شگفتہ انداز بیان کی بھی۔''

(شارب ردولوی شخصیت اور تنقید نگاری، ڈاکٹر عرشیہ جبین، ص:۲۵۶)

''تنقیدی مطالعے'' ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی جو شارب ردولوی کی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے کا عنوان ''تنقید ومحاسبہ'' ہے جس میں سات مضامین ہیں دوسرے کا عنوان ''انیسیات'' ہے جس میں تین مضامین ہیں اور تیسرے حصے کا نام ''مطالعے'' ہے جس میں کل پانچ مضامین شامل ہیں۔ کتاب ''اردو مرثیہ'' ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی جو ۱۹۸۷ء میں غالب اکادمی نئی دہلی میں منعقد ہونے والے سمینار کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے کا عنوان ''تاریخی جائزے'' ہے جس میں آٹھ مضامین شامل ہیں۔ دوسرا حصہ ''تنقیدی جائزے'' کے نام سے ہے جس میں بارہ مضامین شامل ہیں۔ تیسرے حصے کا عنوان ''شخصی جائزے'' ہے جس میں چھ مضامین شامل ہیں، جس میں ایک مضامین شارب ردولوی کا بھی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر نیر مسعود، ڈاکٹر تنویر احمد علوی وغیرہ جیسی شخصیات کے مضامین شامل ہیں۔ ''آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید'' کتاب بھی شارب ردولوی کی مرتبہ تصنیف ہے جس میں محققین اور ناقدین کے ۲۱ مضامین شامل ہیں۔ ''معاصر اردو تنقید مسائل ومیلانات'' یہ کتاب بھی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں کل پندرہ مضامین شامل ہیں جو ۱۹۹۳ء میں اردو اکادمی دہلی کی جانب سے دوروزہ سمینار میں پڑھے گئے تھے۔

''تنقیدی مباحث'' شارب ردولوی کی بارہویں کتاب ہے جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں شامل ۱۸ مضامین انھوں نے بین الاقوامی ادبی سمیناروں میں

پڑھے تھے۔تنقید کے تعلق سے یہ کتاب بہترین اور اعلی ہے۔انھوں نے اپنی تنقید نگاری کے ذریعہ ادب کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ان کے مضامین کے عنوان ''ہم عصر اردو تنقید چند مسائل''،''سید سلیمان ندوی کی تنقید نگاری''،''جدید غزل میں علامت نگاری''،''حسرت کی شاعری میں جنسی تلازمے'' وغیرہ ہیں۔ان مضامین کے عنوان سے ہی اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے انھوں نے تنقید کے پیرائے میں رہ کر ادب کے مختلف گوشوں کا مطالعہ بڑے فنکاری سے کیا ہے۔ڈاکٹر شارب ردولوی اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''یہ مضامین مختلف موضوعات پر ہیں اور کئی برس کے عرصے کو محیط ہیں میں نے انھیں تاریخی اعتبار سے ترتیب دینے کے بجائے موضوعات کے لحاظ سے مرتب کیا ہے تا کہ ان میں ایک تسلسل پیدا ہو سکے۔مضامین کے آخر میں ماہ وسال کی نشاندہی کر دی ہے۔ان مضامین یا اپنے نظریات کے بارے میں خود کچھ اظہار خیال کرنا اس لئے مناسب نہیں سمجھتا کہ مضامین خود ہی اس کا اظہار ہیں اس کے علاوہ میں یوں بھی کسی ادّعا کا قائل نہیں۔تنقید میں یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر بات سے ہر شخص کو اتفاق ہو۔اختلاف بھی فکر کو مہمیز کرتا ہے بشرطیکہ اس کی بنیاد تنگ نظری پر نہ ہو اگر یہ مضامین سوچنے پر مجبور کریں اور ان سے نئی فکر کے راستے کھلیں خواہ ان کی سمت مختلف ہی کیوں نہ ہو، تو یہی بہت ہے۔''

(تنقیدی مباحث، شارب ردولوی، ص:۹،۱۰)

''جدید اردو تنقید اصول ونظریات'' کو ہم ان کی سب سے اہم تصنیف تسلیم کر سکتے ہیں کیوں کہ اسی مقالے پر انہیں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل ہوئی جو پہلی مرتبہ کتابی شکل میں ۱۹۶۸ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی۔اس کتاب کی اہمیت اس لئے بڑھ جاتی ہے کیوں کہ اس کتاب کے اب تک سات ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں اور ہر مرتبہ اس کتاب میں شارب ردولوی نے کچھ نہ کچھ اضافہ اور رد وبدل کر کے اسے شائع کیا ہے۔اس کتاب کے ذریعہ تنقید کے ہر پہلو سے واقفیت ہو جاتی ہیں۔اگر کوئی شخص تنقید کے معنی ومفہوم کو سمجھنا چاہے اور جسے تنقید کے متعلق کچھ بھی علم نہ ہو وہ اس کتاب کو پڑھ کر استفادہ حاصل کر سکتا ہے۔اس کتاب کے پہلے اڈیشن کے دیباچہ میں شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''ادب کو زندگی کا مظہر اور حیات کی تفسیر کہا گیا ہے جو نیرنگ زمانہ کے ساتھ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے جو چیز ہمیشہ بدلتی رہتی ہو اس کی پرکھ کے کچھ اصول بھی سخت اور بے لچک نہیں ہو سکتے اس لئے اس مقالہ کے عنوان سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس میں تنقید کے اصول بنا دئے گئے ہیں اور ادب کو اب انہیں

اصولوں پر پرکھنا چاہئے بلکہ اس مقالہ میں پہلی بار اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ابتدا سے آج تک اردو تنقید میں جو رجحانات رہے ہیں وہ خواہ کسی ادبی تحریک کے سبب آئے ہوں یا مغربی علوم سے واقفیت کی بنا پر ان سب کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان کے رجحانات اور اشارے اردو کے کن ناقدین کے یہاں ملتے ہیں اور ادب کی پرکھ کے لئے کس حد تک مناسب اور قابل قبول ہیں۔

(جدید اردو تنقید اصول ونظریات، شارب ردولوی، ص ۸، ۹)

ان کی تصانیف میں ''اردو مرثیہ کی ادبی اہمیت''، ''اسرار الحق مجاز'' بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے خودنوشت بھی تحریر کیا ہے جس کا نام ''نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہاں معلوم'' ہے جو ان کے چاہنے والوں کے لئے بیش بہا خزانہ ہے۔ اردو ادب کی دنیا میں اپنی تصانیف سے مالا مال کرنے والا یہ ادیب ۱۹ / اکتوبر ۲۰۲۳ کو دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا لیکن اپنی ادبی کاوشوں کی وجہ سے وہ ہمیشہ لوگوں کے دلوں میں آج بھی زندہ ہے۔

☆☆☆

Mohd. Alvi ki Fankarana Inferadiyat by Uzma Ansari (Research Scholar,Dept. of Persian and Urdu, University of Gujrat,Ahmedabad)
عظمیٰ انصاری (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو/ فارسی، گجرات یونیورسٹی، احمد آباد)

محمد علویؔ کی فنکارانہ انفرادیت

چھپا کر نہ آنکھوں میں رکھ پاؤ گے کوئی خواب نیندیں چُرا جائے گا

سرزمینِ گجرات ہر زمانے میں مختلف علوم وفنون کا مرکز رہا ہے۔ یہاں مختلف نابغۂ روزگار شخصیات نے عہد بہ عہد اپنی علمی کاوشوں سے علم و ادب کے پرچم بلند کیے اور اپنے علم و ہُنر سے ہندوستان کے باذوق شائقین ادب کو متعارف کرا اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ ابتدائی دنوں میں صوبۂ گجرات کو علمی و ادبی سرمایہ عطا کرنے والوں میں اولیاء وصوفیائے اکرام کا اہم کردار رہا ہے جنہوں نے اپنے پیغام رسانی کے لیے اردو زبان کو پسند کیا اور اپنے ملفوظات وفقرات اردو میں نظم کر اردو زبان کو فروغ بخشا، اس کے بعد اردو ادب کے میدان میں ایسے نامور ادباء وشعراء نے جنم لیا جن کے ادبی کارناموں کا اعتراف ملک گیر پیمانے پر ہوا۔ ان نامور ادباء وشعراء میں سب سے پہلا نام اردو ادب کو صنف غزل سے صحیح معنوں میں متعارف کرانے والے شہنشاہ غزل ولی محمد ولیؔ کا آتا ہے۔ ولیؔ کا تعلق اسی سرزمینِ گجرات اور خاص کر شہر احمد آباد سے رہا ہے۔ ان کے علاوہ عہدِ میرؔ وغالبؔ سے لے کر اُن کے تلامذہ کے بہت سے نام گجرات کے مختلف شہروں میں پائے جاتے ہیں جن میں سورت کے میر عبدالولی عزلتؔ، اخترؔ آفاق، آمرؔ سورتی، بڑودہ کے افسرؔ، خلشؔ بڑودوی، عباسؔ دانا اسی طرح شہر احمد آباد کے زخمیؔ، کاملؔ، حزیںؔ اور استاد شاعر کلیمؔ احمد آبادی وغیرہ مشہور ومعروف ہیں۔

اسی طرح پچھلی چند دہائیوں میں گجرات کی ادبی تاریخ پر جب ہم ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو گجرات کے شہر احمد آباد میں اردو ادب کا ایک کہکشاں نظر آتا ہے۔ ان مایۂ ناز شخصیات میں اردو ادب کے نامور اور جید نقاد سید وارث حسین علوی جنہوں نے اپنی تنقید نگاری سے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا، مظہر الحق علویؔ کا اسمِ گرامی ایک ایسا نام ہے جن کے فنّی تراجم ہندوستان میں ہی نہیں دنیا بھر اپنی شہرت کا بلند مقام رکھتے ہیں۔ شعرا میں عادلؔ منصوری، رشیدؔ افروز، سرشارؔ بلند شہری اور پہلی

باردلت سماج و پسماندہ طبقات کے خیالات ورجحانات کو شعری جامہ پہنانے والے مابعد جدید دلت شاعر جینت پرمار وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

انہیں شعراء وادباء میں احمد آباد کی سرزمین سے اپنی شاعری اور تخیل کی پرواز لیے چھوٹی چھوٹی بحروں کی غزلوں میں سہل ممتنع انداز میں نت نئے موضوعات کا استعمال کر ہندوستان کے باذوق قارئین ادب کو اپنی جدید شاعری سے متاثر کرنے والے جدید شاعر محمد علوی سن ۱۹۶۰ء کی دہائی میں اردو ادب کے بام فلک پر نمودار ہوئے۔ عام انسانی زندگی کے شب وروز کی مکمل عکاسی کرنے والے جدید شاعر محمد علوی کا اصل نام سید محمد صاحب تھا۔ آپ احمد آباد کے صوفی منش بزرگ شاہ وجیہ الدین علوی الحسینی الگجراتی کے سجادہ نشیوں کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ ۱۰، اپریل ۱۹۲۷ء میں خان پور سید واڑہ میں پیدا ہوئے۔ گھر کا ماحول دینی و مذہبی تھا اسی لیے آپ کی ابتدائی تعلیم مذہبی طرز پر ہوئی۔ محمد علوی کے والد اپنے نور چشم کو اعلیٰ تعلیم سے سرفراز کرنے کے خواہاں تھے لیکن مزاج میں شوخ پسندی اور گھومنے پھرنے کے شوقین محمد علوی کو کبھی اسکولی تعلیم سے دلچسپی نہیں جاگی یہی وجہ تھی کہ مقامی اسکول میں داخلہ ہونے کے باوجود وہ پانچویں جماعت سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ حالانکہ مستقبل کے فکرمند آپ کے والد صاحب نے ان کا داخلہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی کروایا تھا لیکن یہاں کے علمی ماحول سے انہیں اور بھی زیادہ گھٹن محسوس ہونے لگی اور وہ بہت جلد احمد آباد لوٹ آئے۔

محمد علوی کا بچپن سے آخری وقت تک کا زمانہ اپنے دو کزن برادر و عزیز دوست سید وارث حسین علوی اور مظہر الحق علوی کے ساتھ گزرا اور انہی کی ادبی صحبت میں محمد علوی نے مطالعہ کی ابتداء کی۔ فصیلِ شہر احمد آباد کے خاص بازار تین دروازہ میں واقع کلیم بک ڈپو اس دور کی ادبی شخصیات کی اہم ملاقات گاہ تھی جہاں سے تینوں علوی برادران نے اپنی ادبی زندگی کو پروان چڑھایا۔ ساتھ ہی گھومنے پھرنے کے شوق نے محمد علوی کو دہلی و ممبئی کا مسافر بنا دیا تھا اور ادبی مطالعہ کی دلچسپی کے باعث یہاں کے ادباء و شعراء اور خاص کر ترقی پسندوں سے آپ کی ملاقات رہتی تھی۔ ابتداء میں محمد علوی نے کہانیاں تخلیق کیں جو ہمایوں، شاہد، نظام وغیرہ رسائل میں شائع ہوئیں لیکن جب تینوں علوی برادرانِ نے احمد آباد میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم کی تو محمد علوی کا ذہن بھی بدل گیا۔ مشاعروں میں شرکت کرنے کے بعد ترقی پسند شعراء سے متاثر ہو کر محمد علوی نے نثری جامہ اتار پھینکا اور دوسروں کے طرز میں انقلابی نظمیں کہنے لگے لیکن یہاں ایک بات عرض کرتے چلوں کہ محمد علوی نے گاہے بہ گاہے

شاعری کی ہے۔ وہ احمد آباد کے اے۔ گریڈ بلڈنگ کانٹریکٹر تھے اور کئی کئی مہینوں بلکہ سالوں تک شاعری سے دور رہ کر اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے لیکن جب شاعری کی جانب متوجہ ہوتے تو ایک ایک دن میں پانچ پانچ، چھ، چھ غزلیں و نظمیں کہہ ڈالتے تھے۔ جس کا اعتراف وہ اپنے غزلیہ اشعار میں یوں کرتے ہیں:

ایک غزل اور کہہ لو علویؔ — بھر برسوں تک چپ رہنا ہے
جی تو علویؔ چاہتا ہے بارہا — شعر کہنے کی مگر فرصت کہاں
شعر تو کہتے تھے ہم سچ ہے یہ علویؔ مگر — تم کو سناتے کبھی اتنی بھی فرصت نہ تھی
ملا نہ علویؔ نام ادب کے دفتر میں — پانچ برس چپ رہنے کا انعام ملا

ابتداء میں محمد علویؔ نے دوسروں کے طرز میں اپنے خیالات قلمبند کیے لیکن جدیدیت کی آمد کے بعد جب علویؔ صاحب ادب کی جانب لوٹے تو آپ کا طرز اسلوب انفرادیت حاصل کر چکا تھا۔ آپ کی پہلی جدید غزل جو رسالہ ادب لطیف لاہور میں شائع ہوئی اس کا مطلع اور ایک شعر ملاحظہ کریں:

غمِ جاناں کو ابھی اور بھی گزرجانا تھا — زہر بن کے مری رگ رگ میں اتر جانا تھا
ان کا آنا بھی تھا ہنگامۂ محشر کی مثال — ان کا جانا بھی قیامت کا گزر جانا تھا

محمد علویؔ نے اپنی شاعری کے پیمانے خود وضع کیے جو سماجی و معاشرتی زندگی کے گرد و پیش کا آئینہ تھے۔ محمد علویؔ کا منفرد زاویۂ نگاہ ان کی توجہ عام سے بھی عام معمول کی جانب مبذول کرواتا ہے۔ جانی بوجھی چیزیں محمد علویؔ کی قلم کی زد میں آکر اجنبی بن جاتی ہیں اور روز کے دیکھے ہوئے واقعات میں نئے پن کا احساس پیدا ہوجاتا ہے۔ محمد علویؔ کی انفرادیت ہے کہ ان کی تخلیقی زبان عام عوام سے قربت رکھتی ہے اور آپ کا کلام عربی و فارسی کے ادق و گنجلک لفظوں اور پیچیدہ تشبیہوں و استعاروں سے پاک ہے۔ علویؔ صاحب نے روزمرہ کی دوستانہ بول چال کی زبان میں ایک عام فرد کی زندگی کا مکمل احاطہ کیا ہے۔ صبح صادق سے لے کر رات کی تنہائی میں اپنے وجود کی تلاش کرتے ہوئے فرد کی تمام کیفیات کا بیان محمد علویؔ کے کلام میں جا بجا بکھرا ہوا ہے۔ جنگ کا ماحول، جنگ کے بعد کے حالات و واقعات، فرد کی ذاتی زندگی کے مسائل، رشتوں کی بے رُخی کا احساس، گھر، گلی، محلہ، شہر و ملک کے سیاسی حالات وغیرہ تمام مسائل پر علویؔ صاحب نے صرف نظر کی ہے۔ علویؔ صاحب کے شعری کائنات میں چار شعری مجموعے بالترتیب ''خالی مکان''، ''آخری دن کی تلاش''، ''تیسری

کتاب''، اور ''چوتھا آسمان'' اور ایک کلیات ''رات ادھر ادھر روشن'' کا شمار ہوتا ہے۔

محمد علوی سماج و معاشرے کے نباض شاعر ہیں ساتھ ہی انہیں حواس کا شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ زندگی کے رنگ منچ پر رونما ہوتے تمام منظر کو محمد علوی ایک ماہر مصور کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انہیں لفظی پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان کے سیدھے سادے کلام میں احساسات و تجربات کی فراوانی ملتی ہے۔ علوی صاحب نے جہاں سہل ممتنع انداز اختیار کیا وہیں ان کے کلام میں احساس کا دوسرا پن بھی موجود ہے یعنی وہ اپنی شاعری کو سیدھے سادے انداز میں شروع کر احساس کے دوسرے رُخ پر موڑ دیتے ہیں جو باذوق قاری کو متعجب کی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ محمد علوی کا یہی منفرد اسلوب انہیں اپنے عصر حاضر کے شعراء میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ اس طرز کے کچھ اشعار ملاحظہ کریں:

سامنے دیوار پہ کچھ داغ تھے — غور سے دیکھا تو چہرے ہو گئے
بہت خوش ہوئے آئینہ دیکھ کر — یہاں کوئی ثانی ہمارا نہ تھا
آگ اپنے ہی لگا سکتے ہیں — غیر تو صرف ہوا دیتے ہیں
تو مجھ کو بھول گئی ہے مگر کبھی نہ کبھی — میں تیرا کون ہوں مٹّی تجھے بتاؤں گا
کچھ اتنا گہرا تعلق رہا ہے اشکوں سے — خوشی کے وقت بھی اب آنکھ مسکراتی نہیں

محمد علوی نے جب اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے قلم اٹھایا اس وقت جدید رجحانات کا دور دورہ تھا۔ آپ نے ایک ایسے عہد میں سانس لی جہاں ہر طرف تنہائی، افسردگی، بے بسی، بے گھری، بے درکاری اور عدم تحفظ و عدم اعتبار جیسے معاملات چہار سُو بکھرے ہوئے تھے۔ آزادئ ملک اور تقسیم ہند کے واقعات نے ہر فرد کو ذہنی انتشار کا شکار بنا دیا تھا۔ سکون و اطمینان ختم ہو چکے تھے، ہجرت کی وجہ سے ہر فرد اجنبیت کا شکار ہو کر شک و شبہات میں گھر گیا تھا۔ ساتھ ہی جدید الیکٹرونکس آلات کی ایجادات سے روز بروز انسانی زندگی نئے نئے تغیرات و رجحانات سے دو چار ہو رہی تھی۔ علوی صاحب کا پہلا شعری مجموعہ ''خالی مکان'' کی اکثر غزلیں و نظمیں انہی رجحانات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ کچھ اشعار دیکھیں جو اس دور کی مکمل عکاسی کرتے ہیں:

آنکھ کھلتے ہی ملیں گے آنسو — اور کچھ خواب کی تعبیر نہیں
کیا ظلم ہے شہر میں رہنے کو گھر نہیں — جنگل میں پیڑ پیڑ پہ تھا گھر بنا ہوا
بلا رہا تھا کوئی چیخ چیخ کر مجھ کو — کنویں میں جھانک کر دیکھا تو میں ہی ''اندر'' تھا

لمبی سڑک پر دور تلک کوئی بھی نہ تھا پلکے جھپک رہا تھا دریچہ کھلا ہوا
ہائے وہ لوگ جو دیکھے بھی نہیں یاد آئیں تو رُلا دیتے ہیں
نہ کام آئے گا یہ گوشت کا بدن علوی مشینی دور ہے لوہے میں کیوں نہ ڈھل جاؤں

محمد علوی کا کلام متنوع موضوعات پر مشتمل ہے۔ان کی موضوعاتی شاعری میں فسادات کا ہولناک منظر، خدا کے نہ ہونے کا غم، خوف، خواب، مچھلی کی بو، زندگی وموت وغیرہ عناصر متحرک نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دوسرے شعری مجموعہ ''آخری دن کی تلاش'' میں احمد آباد میں ہوئے فسادات کی بہترین منظر کشی کی ہے جو ان کا دیدۂ بینائی اور ذاتی تجربہ تھا۔اس ضمن □ ن میں تخلیق کیا گیا ہر شعر سچائی اور حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔شعر دیکھیں:

کھڑکیوں سے جھانک کر گلیوں میں ڈر دیکھا کیے گھر میں بیٹھے رات و دن دیوار و در دیکھا کیے
زمیں کہیں بھی نہ تھی چہار سو سمندر تھا کسے دکھاتے بڑا ہولناک منظر تھا
اوروں کا گھر جلا کر قیامت نہ کر سکا گھر جل گیا مگر شکایت نہ کر سکا

غزلوں کے علاوہ نظموں میں بھی فسادات کی بہترین تصویر پیش کی گئی ہے۔ ایک نظم دیکھیں عنوان ہے:''جل مرنے سے پہلے''

کھڑکی بند کرو/ دروازہ مت کھولو/ بولنا ہی ہے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں بولو/ شور گلی تک آ پہنچا ہے/ جل مرنے سے پہلے/ آؤ گلے مل کر رو لو۔

لوگوں کے کرب کی منظر کشی کے درمیان قدرتی آفات کے بیان میں علوی صاحب انداز تخاطب کا اسلوب اپناتے ہوئے ''گجرات کے زلزلے'' پر یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

آنے سے پہلے کم سے کم ایک خط تو بھیج دیا ہوتا
ہم تیرا سواگت کرنے کو گھر سے سڑکوں پر آ جاتے
گھر یوں نہ ہم کو کھا جاتے

محمد علوی کے کلام میں ''خدا کا تصور'' انکار و اقرار کی صورت میں موجود ہے۔علوی صاحب کبھی خدا کے منکر نظر آتے ہیں اور اس کے نہ ہونے کا غم مناتے ہیں تو کبھی ان کا انفرادی مشاہدہ انہیں اس نقطہ پر پہنچا دیتا ہے کہ خدا اور وہ ایک ہی آگ میں یعنی تنہائی کی آگ میں جل رہے ہیں اور انہیں اس کا شدید دکھ پہنچتا ہے کہ انہوں نے آج تک خدا کو کیوں نہ جانا۔اس طرح کی بہت سی نظموں میں نوحہ، خدا، ممی بنا کر، پاگل، پیشکش، پہلا خدا، مگر میں خدا سے کہوں گا، میں اور تو وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

ان کا تیسرا شعری مجموعہ ''تیسری کتاب'' کا انتساب بھی علوی صاحب نے یوں رقم کیا ہے:

''خدا کے نام: (جس کے نہ ہونے کا مجھے دکھ ہے)۔''

محمد علوی کے اسی انفرادی اسلوب کے تحت عتیق اللہ نے اپنے مضمون میں انہیں سیدھی منطق کا مشکل شاعر کہا ہے اور محمود ہاشمی نے ان کے کلام میں خدا کے تصور کے بیان میں ان کی نظم ''میں اور تو'' کو ان کی تمام شاعری کا کتھارسس قرار دیا ہے۔ جبکہ ان کی ایک نظم گھوڑے پر ایک لاش'' جس کا آخری شعر ہے:

حیرت کی تصویر گری چکراتے گدھ کی آنکھوں سے
گونج اٹھی ساری وادی زخمی گھوڑے کی ٹاپوں سے

کے ڈرامائی انداز پر شمس الرحمن فاروقی صاحب اپنے مضمون ''دوسرا ورق اور تیسری کتاب'' میں یوں گویا ہوتے ہیں:

''نظم کی فضا میں شجاعت، بے خوفی، خوف انگیز فرار، موت کی بھیانک حیرت لیکن اس کے ہونے کا یقین، گھوڑے کی بے زبانی اور اس کے سوار کی بے زبانی یہ سب اس صلابت اور قوت سے بیان ہوئے ہیں کہ اس کے سامنے ہمارے زیادہ تر شاعروں کی زیادہ تر نظمیں کھانستی ہوئی چڑچڑی بوڑھی عورتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ نظم محمد علوی کی شاعری ہی نہیں، بلکہ تمام جدید شاعری میں ایک بلند و تنومند سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔''[۱]

(دوسرا ورق اور تیسری کتاب از شمس الرحمن فاروقی، رسالہ سابرنامہ محمد علوی نمبر ص ۱۲۱)

دہشت گردانہ ماحول اور خدا کی غیر موجودگی موت کا شدید احساس کرواتی ہے لیکن محمد علوی کا انفرادی رویہ موت میں مثبت پہلو ڈھونڈ کر اسے ماں کی آغوش سے تعبیر کر دیتا ہے جو دنیا کی واحد سکون و اطمینان کی جگہ ہے۔ نظم ''موت'' دیکھیں:

تو ہم سب کی ماں ہوتی ہے — ہم سب تیری گود میں آ کر
گہری نیند میں کھو جاتے ہیں — دیکھ میں تیرے پیچھے کب سے
ہاتھ پسارے بھاگ رہا ہوں — ماں مجھ کو بھی گود میں لے لے
میں برسوں سے جاگ رہا ہوں

ان کے کلام میں موت سے خوف نہیں ملتا۔ وہ بیان کو احساس کے دوسرے پن سے جوڑ کر اس میں انوکھی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ نظم ''مچھلی کی بو'' میں ایک کلرک کی زندگی کے عام روٹین دن

کا ذکر کرتے ہوئے اس کی کیفیت بیان کرتے ہیں کہ وہ رات گئے بستر میں لیٹے لیٹے دوسرے دن کی پلاننگ کر رہا ہوتا ہے کہ اسے کل کپڑے آلٹر کرنے درزی کو دینے جانا ہے، صابن کی ڈبیا ختم ہو چکی ہے وہ بھی لانی ہے، آفس کے کام سے تھکا ہارا فرد چھٹی کے خواب دیکھتا ہے اور تاش کے پتے کھیلنا چاہتا ہے ساتھ میں درزی کی دکان سے لگ کر جو ہوٹل ہے اس کی ٹیسٹی مچھلی بھی اسے کھانی ہے اتنی سب پلاننگ کے بعد شاعر اپنے انفرادی نظریہ سے نظم کے آخر کو تجسس آمیز انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

اتنا بہت سا سوچ کر وہ/ سویا تھا مگر/ پھر نہ اٹھا!/ دوسرے دن جب اس کا جنازہ/ درزی کی دوکان کے پاس سے گزرا تو/ ہوٹل سے مچھلی کی بو/ دور دور تک آئی تھی!

متنوع موضوعات کے ساتھ ساتھ محمد علویؔ نے اپنے کلام میں مخصوص لفظیات کا بھی استعمال کر علامتی و استعاراتی انداز میں غزلیں و نظمیں کہی ہیں۔ ان مخصوص لفظیات میں گھر، جھروکہ، دوپہر، دھوپ، رنگ، پیڑ، جنگل، شہر، چاند، سورج پرندے وغیرہ کا استعمال اس عہد کی مکمل عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کچھ اشعار دیکھیں:

کھڑکی سے جب گھر میں دھوپ اترتی ہے — سردی سے مرجھائے بدن کھل اٹھتے ہیں
گھر سے چلا تو چاند میرے ساتھ ہو لیا — پھر صبح تلک وہ میرے برابر چلا کیا
نام رہتا ہے زبان پر اس کا — گھر میں رہتی ہے ضرورت اس کی
ایک بوسیدہ سا گھر چھوڑ گئی — لے گئی ساتھ جنت اس کی
جنگلوں میں راہ جاتی ہے — شہر میں کیوں پھرا کرے کوئی
آکاش میں آرام سے اڑتے ہیں پرندے — جیسے نہ کبھی لوٹ کے آئیں گے زمیں پر
کچھ پرندے اڑے فضاؤں میں — ہو گئے گم نکل کے منظر سے

مختصر نظموں اور چھوٹی چھوٹی بحروں سے تکمیل کی گئی غزلوں میں بھی محمد علویؔ نے اسی طرح کا تجسس آمیز بیان پیش کیا ہے، جو سیدھی سادی بات کو احساس کے دوسرے پن پر موڑ دیتا ہے۔ مختصر نظموں کی تخلیق میں محمد علویؔ کو ملکہ حاصل ہے۔ وہ دو چار مصرعوں میں اپنے خیالات و مشاہدات پر و کر قاری کو متعجب کی کیفیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ان کی سب سے مشہور مختصر نظم ''تخلیق'' گوش گزار کیجیے:

ایک زنگ آلودہ/ توپ کے دہانے پر/ ننھی مُنّی چڑیا نے/ گھونسلہ بنایا ہے!

اسی طرح کی اور نظمیں دیکھیں: نظم: مشورہ

راتوں کو سونے سے پہلے/ نئ پرانی یادوں کو/ اُلٹ پلٹ کرتے رہنا/ ورنہ کالی پڑ جائیں گی/ اِدھر اُدھر سے سڑ جائیں گی!

''ایک نظم'' کے عنوان سے بھی علویؔ صاحب نے کئی نظموں کو اپنے خیالات کا جامہ پہنایا ہے۔جن میں صبح، دوپہر، شام، رات، نئے سال کا سورج، خوابوں اور یادوں کا تصور وغیرہ ملتا ہے۔

ایک نظم:

خواہش کو مت چھونا/ ورنہ/ اس کی کوکھ سے/ بے کیفی/ باہر آئے گی!

ایک نظم:

سکستہ مکانوں کے نیچے/ اندھیرا کھڑا تھا/ نئے سال کا زرد سورج/ محلہ کے گھورے پہ اوندھا پڑا تھا!

محمد علویؔ کے کلام میں ایک متحرک عمل غیر مرئی اشیاء کو مرئی بنا کر پیش کرنا بھی ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں فطری عناصر کو اپنے خیالات و کیفیات عطا کر انہیں حُرکی احساس میں ڈھالا ہے۔ ان کے یہاں رات، سمندر، دریا، چاند، پیڑ، جنگل، کُرسی، سڑک وغیرہ چیزیں زندہ و متحرک نظر آتی ہیں۔اس طرز کے کچھ اشعار دیکھیں:

زمین لوگوں سے ڈر گئی ہے　　سمندروں میں اتر گئی ہے

رات ساحل پر کھڑی روتی ہے　　چاند اترا ہے بھرے دریا میں

نیم کا سایہ اونگھ رہا تھا　　اور رستہ سنسان پڑا تھا

گلدان میں گلاب کی کلیاں مہک اٹھیں　　کُرسی نے اس کو دیکھ کر آغوشِ وا کیا

محمد علویؔ کا فن ایک ڈسپلن رکھتا ہے جو قاری کو الجھائے بنا اسے حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے کہ ان باتوں کو یوں بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔حساس ذہن کے مالک محمد علویؔ نے اپنے عصر حاضر کے تمام رجحانات و میلانات کا بیان منفرد انداز اور جدید طرز اسلوب میں پیش کر جدید شعراء میں اپنا ایک مقام حاصل کیا ہے۔آخر میں ایک شعر کے ساتھ میں اپنا مضمون ختم کرتی ہوں:

جاتے جاتے دیکھنا پتھر میں جاں رکھ جاؤں گا　　کچھ نہیں تو ایک دو چنگاریاں رکھ جاؤں گا

کتابیات

(۱) شعری مجموعہ'' خالی مکان''، از محمد علویؔ، مجموعہ مکتبہ سوغات۔۱۹ کلائن روڈ۔بنگلور ۵ ۱، ۱۹۶۳ء

(۲)شعری مجموعہ ''آخری دن کی تلاش''، ازمحمد علوی، شب خون کتاب گھر، ۱۹۶۷ء
(۳)شعری مجموعہ ''تیسری کتاب''، ازمحمد علوی، دریا گنج، دہلی ۱۱۰۰۰۲، ۱۹۷۸ء
(۴)شعری مجموعہ ''چوتھا آسمان'' ازمحمد علوی، اے ون آفسیٹ پریس نئی دہلی۔ ۲، ۱۹۹۱ء
(۵)کلیات ''رات ادھر ادھر روشن''، ازمحمد علوی، گجرات ساہتیہ اکادمی، ۱۹۹۵ء
(۶)سابرنامہ ''محمد علوی نمبر: شخصیت وشعری کائنات''، گجرات ساہتیہ اکادمی، ۲۰۱۹ء، ۲۰۲۰ء

☆☆☆

Nuskha-e-haye-Khati by Intikhab Alam (Reseaech Scholar,dept.of Persian, MANUU, Hyderabad)

انتخاب عالم (ریسرچ اسکالر بخش فارسی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد)

نسخہ ہائے خطی

ہر قوم کی ثقافت اور شناخت کو سمجھنے اور محفوظ رکھنے کے لیے سب سے اہم راستہ یہ ہے کہ ہم اپنے گذشتہ دور کی میراث کو مدنظر رکھیں۔ اس کے مطابق، گذشتہ نسلوں کی میراث کو محفوظ کرنا اور عوام تک پہنچانا بہت ضروری ہے، اور ان میں سب سے اہم مثال نسخ خطی ہیں جو کہ گذشتہ دور کی تحریروں کی دستاویزات ہیں۔ ان کی حفاظت اور تصحیح میں کوشش کرنا ضروری ہے۔ بدقسمتی سے، کچھ یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں نسخ خطی کی تصحیح پر مثبت نظر نہیں رکھی جاتی اور اس کی اہمیت واضح نہیں ہے۔ اسی لیے اس تحقیق میں پہلے نسخ خطی کی اہمیت بیان کی جائے گی اور پھر ان کی تصحیح کے بارے میں نکات بیان کیے جائیں گے۔

نسخ خطی کی اہمیت اس قدر ہے کہ یہ نسخے اپنے دور کی ثقافتی، سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تاریخی حالات کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی تصحیح اور فارسی زبان میں ترجمہ کرنا معاشرتی ثقافت کی غنی بنانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ نسخ خطی کی تصحیح کے حوالے سے اس مضمون میں قیاسی، التقاطی، تصحیح براساس نسخہ اساس اور بینابین طریقوں کے بارے میں مفید نکات بیان کیے جائیں گے۔ نیز، مقدمہ، حاشیہ اور تعلیقات کے بارے میں بھی تفصیلات دی جائیں گی۔ قدیم متون کے استعمال کی اہمیت، نسخ خطی کی تصحیح کا مقصد، نسخ خطی کی حفاظت اور تصحیح کی روشنی کے مختلف طریقے اس مضمون کے بنیادی نکات ہیں۔

تحقیقی ماہرین نے تاریخ کے دوران انسانوں کے درمیان رابطے کے دو بنیادی اقسام کی نشاندہی کی ہے، جو زبانِ گفتاری اور زبانِ تحریری ہیں۔ دوسرے الفاظ میں، زبانِ گفتاری، جو انسانوں کے درمیان بات چیت کی سب سے نمایاں شکل ہے، کے بعد زبانِ تحریری نے انسانی تہذیب کے میدان میں قدم رکھا اور تاریخ کی پیچیدگیوں میں انسانی رابطے کا بڑا بوجھ اٹھایا۔ اگرچہ

زبانِ گفتار اور تحریر کے علاوہ زبانِ حرکات، زبانِ فکری، اور دیگر بہت سے عناصر کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے، مگر بہر حال زبانِ گفتار اور تحریر انسانی رابطے کے سب سے اہم طریقے رہے ہیں۔

مٹی کی تختیاں، دھات، درخت کی چھال، اور جانوروں کی کھال کے بعد کاغذ کی ایجاد نے زبانِ تحریر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس سے نسخوں کی نقل کی ترقی ہوئی اور خطی کتابیں مذاہب، قوموں کے درمیان گفتگو اور انسانی علم کے تبادلے کے لیے بہترین ذریعہ بن گئیں۔ شروع ہی سے، خطی نسخے معلومات کے بنیادی مصدر کے طور پر حکمرانوں، اشراف اور تعلیم یافتہ افراد کے لیے رہے۔ جب مسلمانوں نے علمی نقطہ نظر اپنایا، تو انہوں نے علم کی ترقی اور نئی دریافتوں میں اہم کردار ادا کیا اور طاقتور حکمرانوں میں شامل ہو گئے۔ کتاب کی ترقی میں بنیادی کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہر قوم کی طاقت تین عوامل پر منحصر ہوتی ہے: ۱) فوجی طاقت، ۲) اقتصادی خوشحالی، اور ۳) فکری اقتدار۔ اس میں، فکری اقتدار کسی قوم کی ترقی، خوشحالی، اور دیگر قوموں پر برتری کا کلید سمجھا جاتا ہے۔ تاریخ یہ ظاہر کرتی ہے کہ کتابخانوں نے سماجی، ثقافتی، اور عقلانی تبدیلیوں میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ کتابخانوں کا ابتدائی مقصد انسانی عقل کے مظاہر کو محفوظ کرنا تھا، جو کہ مادی اشیاء جیسے نسخے اور کتابوں کی شکل میں موجود تھے، اور تحقیق اور مطالعے کے لیے ضروری وسائل فراہم کرنا تھا، جو افراد یا تنظیموں کے ذریعے جمع اور منظم کیے گئے تھے۔

اسلامی تاریخ میں، اسلامی تمدن اور علوم کی گہرائی نے پڑھائی اور لکھائی کے مہارت کو تیزی سے ترقی دی۔ بلا شبہ، اسلامی تاریخ میں پڑھائی اور لکھائی کی ترقی بہت تیز تھی۔ پہلی تعلیمی ادارے جو کہ پڑھائی اور لکھائی کی تعلیم کے لیے قائم کیے گئے، وہ وہ تھے جو جنگ بدر کے قیدیوں نے مدینہ کی مسجد میں قائم کیے تھے تاکہ اپنی آزادی کے بدلے میں علم حاصل کر سکیں، جو اسلام میں علم اور دانش کی اہمیت کو ثابت کرتا ہے۔ ماضی میں موجود زیادہ تر کتابخانوں میں نسخ خطی شامل تھے، لیکن بدقسمتی سے آج کل ان میں سے بہت سے ضائع ہو چکے ہیں، تاہم خوش قسمتی سے کافی تعداد میں اب بھی موجود ہیں۔ اس لیے باقی ماندہ نسخوں کی حفاظت، دیکھ بھال، اور ان کی دوبارہ تخلیق اور تصحیح پر توجہ دینی چاہیے تاکہ یہ علم اور مواد کے دائرے میں واپس آ سکیں۔ شریفی اس بارے میں لکھتے ہیں:

"ہمارا بڑا حصہ ثقافتی ورثہ ان دستاویزات میں موجود ہے جو ہمارے اجداد نے ماضی سے ہمیں دی ہیں۔ ان نسخوں کا ضیاع ہمارے شناخت اور ماضی سے دوری کے مترادف ہے، اس لیے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان نسخوں کو شناخت کریں اور ان کی حفاظت اور دوبارہ تخلیق کے لیے بہترین حالات

فراہم کریں۔"

مسئلے کی وضاحت: نسخ خطی قیمتی خزانے ہیں جن کی ایک طرف بہترین حالت میں حفاظت ہونی چاہیے اور دوسری طرف ان کی تصحیح اور اشاعت کے لیے کوششیں کرنی چاہئیں۔ دوسرے الفاظ میں، نسخ خطی کو دو زاویوں سے دیکھا جانا چاہیے: ۱) ان کی موجودگی کی اہمیت، اور ۲) ان کی بحالی کی کوششیں۔ نسخ خطی کی حفاظت اور دیکھ بھال کے حوالے سے متعدد مراکز اور مخلص لوگوں کی کوششیں موجود ہیں، جن کی بدولت کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے، البتہ کچھ اقدامات پر تنقید بھی کی گئی ہے۔ لیکن، نسخ خطی کی بحالی کی کوششوں میں مشکلات موجود ہیں۔

اگرچہ بہت ساری قیمتی سرگرمیاں مخلص افراد اور شوقین لوگوں کی جانب سے انجام دی جاتی ہیں، تاہم یہ نظر آتا ہے کہ کچھ محققین اور اساتذہ نہ صرف نسخ خطی کی تصحیح میں دلچسپی نہیں رکھتے، بلکہ اسے وقت کا ضیاع بھی سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ہم نے دیکھا ہے کہ ایک طالب علم جو نسخ خطی کی تصحیح کو اپنی تحقیقاتی موضوع کے طور پر منتخب کرنا چاہتا ہے، اساتذہ کی جانب سے روکا جاتا ہے۔ اسی طرح، اگر کوئی مرکز اپنے مجموعے کی بڑھوتری اور نسخ خطی کی حفاظت کے لیے مقامی لوگوں سے ان کو خریدنے کی کوشش کرتا ہے، جیسے کہ کسی شہر کے میوزیم میں مقامی لوگوں سے نسخ خطی خریدنے کی کوشش کی جائے، تو اس مرکز کا منتظم یا ذمہ دار اس کوشش کو روک دیتا ہے یا کوئی اور مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس مضمون میں کوشش کی جائے گی کہ نسخ خطی اور ان کی تصحیح کی "اہمیت" کو اجمالی طور پر بیان کیا جائے۔

تحقیقی پس منظر: نسخ خطی کی تصحیح کے طریقوں پر اب تک مختلف تحقیقات کی گئی ہیں، جو کہ کتابوں اور مضامین کی صورت میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے دستیاب ہیں۔ مثال کے طور پر، جویا جہانبخش کی کتاب "راہنمای تصحیح متون" اور ڈاکٹر نصرت اللہ فروہر کے مضمون "روش تصحیح متون" ان اہم آثار میں شامل ہیں جو نسخ خطی کے تصحیحی طریقوں کی تفصیل، تحلیل، اور مواد کے جائزے پر مشتمل ہیں۔ ان تحقیقات اور مضامین میں عموماً نسخ خطی کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے، تاہم، اس موضوع پر کوئی آزاد تحقیق نظر نہیں آئی ہے۔

نسخ خطی کی تعریف: نسخ خطی وہ آثار ہوتے ہیں جو عموماً طویل عرصے پرانے ہوتے ہیں اور ہاتھ سے کسی قسم کے قلم کے ذریعے تحریر کیے جاتے ہیں۔ ویکیپیڈیا کی دانشنامہ کے مطابق، نسخ خطی کو ایسے کتابوں اور تحریروں سے تعبیر کیا جاتا ہے جو ہاتھ سے لکھے گئے ہوں۔ خطی نسخوں کا خاور زمین، خاص طور پر ایران میں، بہت قدیم پس منظر ہے۔ قدیم دور میں، فرمانروا عموماً اپنے دربار میں ایک دفتری

نظام (دبیر خانہ) قائم کرتے تھے، جہاں لکھنے والے نسخوں کو لکھتے یا ان کی نقول تیار کرتے تھے۔ درباریوں کے درمیان پرانے نسخوں سے زیادہ نفیس نقول تیار کرنا ایک پسندیدہ سرگرمی تھی۔ زیادہ تر یورپی زبانوں میں "دست نویس" کے لیے لاطینی لفظ "manuscript" استعمال کیا جاتا ہے، جو کہ دو الفاظ "manu" (ہاتھ) اور "script" (تحریر) سے مل کر بنا ہے۔ نسخ خطی، جسے دست نویس بھی کہا جاتا ہے، ایسے قدیم کتابوں کو کہا جاتا ہے جو ہاتھ سے تحریر کی گئی ہوں اور چھپی ہوئی نہ ہوں۔ ادبیات کتابداری میں، دست نویس ایسی تحریروں کو بھی کہتے ہیں جو نویسندہ نے تیار کی ہیں، جیسے کہ ایک ادبی، علمی، یا تاریخی اثر جسے چھاپے کے لیے تیار کیا گیا ہو۔ ان نوعیت کے دست نویسوں کی بڑے تحقیقاتی اور یونیورسٹیوں کی کتابخانوں میں محفوظ کرنے کی اہمیت تحقیقاتی یا آرکائیوی اہمیت کی وجہ سے ہوتی ہے۔

فارسی ادبیات میں "نسخ خطی" سے مراد وہ کتابیں ہیں جو عام طور پر ایران اور اسلامی ممالک میں چھاپے کی صنعت کے آغاز سے پہلے تیار کی گئی تھیں۔ ان نسخوں کی انتقادی ایڈیشن، "تصحیح"، اور ان کی فہرست سازی ایک اہم تحقیقی میدان رہی ہے، جو گذشتہ صدیوں میں ایران اور دیگر اسلامی ممالک میں اہم رہی ہے۔ اسی طرح کی کوششیں مغرب میں بھی کلاسیکی اور وسطی صدیوں کے نسخوں کے حوالے سے کی گئی ہیں۔ اوائل وسطی صدیوں (۵۰۰ سے ۱۰۰۰ عیسوی) میں، دیر اور صومعے کتابوں کی تیاری کے اہم مراکز تھے۔ پادری اور راہب اپنے کلیسائی نیٹ ورک کے ذریعے لاطینی زبان اور کلاسیکی علم کو زندہ رکھتے ہوئے مسیحیت کو پھیلانے کا کام کرتے تھے۔ دیر ادبی اور تحریری مراکز تھے، اور کاپی کرنے والے افراد (کاتبان) ان کے نسخہ نویسی کمرے میں مذہبی اور غیر مذہبی آثار کو ہاتھ سے نقل کرتے تھے۔

نسخ خطی ہر قوم کی ثقافتی سرمایہ اور پشتوانہ ہیں۔ یہ خزانے مختلف صدیوں میں علمی تاریخ اور فنون کی قدر و قیمت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یقیناً کسی بھی سماج کی تمدن کی تاریخ کو جاننے کا ایک طریقہ ان خزانے اور مکتوب آثار کی بحالی ہے جو گذشتہ بزرگان اور دانشوروں سے باقی ہیں۔ نسخ خطی فن کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہے اور اسلامی فنون کے اہم جلوے کو نسخ خطی میں دیکھا جا سکتا ہے، جو مختلف ممالک میں، خاص طور پر ایران میں اور اسلام کے آنے کے بعد مختلف دوروں میں تخلیق کیے گئے۔ نسخ خطی اسلامی زمینوں کی ثقافت، تمدن، اور فن کی نمائندگی کرتے ہیں جو ابتدائی اسلامی صدیوں میں مختلف مقاصد کے لیے ترقی پذیر اور بلند ہوتے گئے۔ ماہیل ہروی نے ہجرت کے ابتدائی سالوں

میں نسخ پردازی اور نسخ خطی کی جمالیات کے بارے میں لکھا ہے کہ مانوی نسخوں، جیسے کہ " کتاب مصورارژنگ " کے موجودگی نے مسلمان نسخ پردازوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ مانوی نسخوں کی تذہیب اور جمالیات نے نسخ پردازوں کی زیبائش کے احساس کو متاثر کیا۔

نسخ پردازی کی ثقافت ابتدائی صدیوں میں مذہبی کتب سے شروع ہوئی، اور پھر علمی کتب تک پھیلی۔ بعد کے صدیوں میں، خاص طور پر نویں ہجری صدی سے، نسخ خطی کے فن نے مختلف شعبوں جیسے کہ ادب، خاص طور پر عرفانی ادب اور شاعری میں بے حد قیمتی نسخے تیار کیے۔ ہر علم کی شاخ اور سائنسی مظاہر کا ایک تکاملی عمل ہوتا ہے جو مخصوص اصولوں اور مراحل کو عبور کر کے علم میں تبدیل ہوتا ہے اور استعمال ہوتا ہے۔ دوسری طرف، خداوند کی طرف سے یہ نوید ہے کہ انسان اشرف المخلوقات کے طور پر ترقی کے راستے پر گامزن رہے۔ یہ عمل اس وقت مکمل ہوتا ہے جب انسان ماضی کے تجربات سے استفادہ کرتا ہے، خاص طور پر ان نظریات، خیالات، اور اقوال کو دوبارہ جائزہ لیتا ہے جو نظرانداز یا فراموش ہو چکے ہیں۔ اس لیے قدیم منابع اور متون کا استعمال ایک طرح کی واپسی ہے اپنے اصل اور شناخت کی طرف، اور خوداعتمادی کی بحالی ہے۔ خصوصاً موجودہ دور میں، جب کہ غلط اور نامناسب مواد آسانی سے دستیاب ہے، ان قدیم منابع کا استعمال محققین اور شوقین افراد کی اعتماداورایمان کو بڑھانے میں مددگار ہوسکتا ہے۔

دوسری طرف، اسلامی ممالک میں علم اور دانش کی جانب اسلام کی دلچسپی اور اس پر زور دینے کی وجہ سے مسلمانوں نے روز بروز علم کی طرف رجوع کیا۔ مواد اور مسائل کی بھاری مقدار کے پیش نظر، ان کے تحریری اور محفوظ کرنے کی ضرورت اجاگر ہوئی۔ مسلمانوں کی ابتدائی ضرورت آیاتِ الٰہی کی کتابت تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتی تھی، اور سورۃ اور آیات کی کثرت کی وجہ سے، بھول جانے، ختم ہونے، اور اضافات کے خطرات موجود تھے۔ اس کے علاوہ، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتاب کو اپنی معجزہ کے طور پر پیش کیا، جس سے کتاب کی اہمیت ابھری اور کتاب اور کتابخانے کی اہمیت اتنی زیادہ ہوگئی کہ انہیں تربیتی اور تعلیمی وسائل کے طور پر تیزی سے قائم اور وسعت دی گئی۔ بلاشبہ کسی بھی معاشرے کی تہذیبی تاریخ کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کا ایک مؤثر طریقہ ماضی کے بڑے بزرگوں اور دانشوروں کے مکتوب آثار اور متون کی علمی وانتقادی بصیرت کے ساتھ احیاء کرنا ہے، جو کسی بھی تعصب یا بغض سے پاک ہو۔ اسی حوالے سے قدیم متون کا تنقید اور تصحیح بھی ہمارے اسلامی معاشرے کے دانشوروں اور محققین کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے، تاکہ اس کی

مدد سے ماضی کے لوگوں اور ان کے نظریات اور عقائد کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے اور درحقیقت اس معاشرے کی علمی اور ثقافتی تاریخ کا جائزہ لیا جا سکے۔ جتنا زیادہ کسی معاشرے کی صلاحیتیں اور سوچ بچار ماضی کے نگارشات کے احیاء اور ان کی دقیق و وسواسی تصحیح کی طرف مرکوز ہوگی، اتنا ہی وہ معاشرہ اپنی علمی اور تہذیبی تاریخ سے بہتر طور پر واقف ہو سکے گا۔

مزید برآں، اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ فارسی زبان کو عالم اسلام میں دوسری زبان کا درجہ حاصل ہے، اسلام کی ثقافت اور تہذیب کا ایک حصہ فارسی مخطوطات کی شکل میں موجود ہے۔ لہٰذا، فارسی، عربی، ترکی اور اردو متون کے احیاء اور تصحیح پر توجہ دینے سے نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کی تہذیب اور ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو وضاحت ملے گی بلکہ یہ ایرانی اور فارسی زبان بولنے والے افراد کی شناخت اور حیثیت کو بھی نمایاں کرے گا۔ لہٰذا، یقیناً مخطوطات کو اہمیت دینی چاہیے اور اولاً ان کے تحفظ اور نگہداشت پر زور دینا چاہیے اور ثانیاً ان کی عالمانہ، دقیق اور موشکافانہ تصحیح پر بھرپور توجہ دینی چاہیے۔

نسخ خطی کی تصحیح کا مقصد: نظر آتا ہے کہ نسخ خطی کی تصحیح کا مقصد پرانی نسخوں کا احیاء اور اس کے نتیجے میں ماضی کے ادبی، سیاسی، تاریخی، ثقافتی اور سماجی نظریات کا احیاء کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، قدیم متون اور تاریخی کتابوں کی بازبینی کا مقصد ان کی قیمتی معلومات کو فارسی زبان میں منتقل کرنا اور علمی و جامعاتی محافل میں پیش کرنا ہے تاکہ وہ ماضی کی بھرپور اور مستحکم ثقافت سے زیادہ سے زیادہ آگاہ ہو سکیں اور اپنے تعلیمی و تحقیقی کاموں میں اعتماد کے ساتھ ان کا استعمال کر سکیں۔ لہٰذا، کسی بھی قدیم متن کو سمجھنے، معادل بنانے اور قابل فہم بنانے کے لیے کئی معتبر پرانے اور جدید مصادر سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ نتیجتاً، اگر کسی کلمہ یا عبارت کی تصحیح، بازشناسی یا معادل سازی کے لیے متعدد مصادر استعمال کیے گئے ہوں اور اگر متن میں کسی پرانے لفظ یا اصطلاح کا استعمال ہو جس کی وضاحت ضروری ہو تو عموماً علمی و تحقیقی مقالات لکھنے کے عام طریقے سے ہٹ کر کام کرنا پڑے گا۔ ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ موضوع کو جتنا ممکن ہو، بغیر کسی کمی بیشی کے، اصل متن کے طور پر پیش کیا جائے اور اگر کسی کلمہ، اصطلاح یا عبارت کی تحقیق کے لیے ایک سے زائد مصادر استعمال کیے گئے ہوں تو بنیادی مصدر کو ایک نمبر کے ساتھ مخصوص کیا جائے اور باقی مصادر کو حوالہ جات کے حصے میں معاون مصادر کے طور پر ذکر کیا جائے۔

لہٰذا، تصحیح کے دوران ایک طرف اصل متن کے ساتھ وفاداری اور اس کی دقیق و مکمل ذکر

کرنے کی ضرورت ہے، اور دوسری طرف، جہاں ضروری ہو، وہاں وضاحتیں اور تجزیے مناسب جگہ پر پیش کیے جائیں۔ استاد مائل ہروی تصحیح کے عمل کو کتاب کی عمر کے برابر سمجھتے ہیں: "عموماً تصحیح یا اصلاح اور کتاب میں تبدیلی کرنا تقریباً کتاب کے برابر عمر رکھتا ہے۔ جب سے بیان کو تحریر میں تبدیل کیا گیا ہے، تب سے تصحیح کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ یہ عمل کسی بھی تمدن یا ثقافت تک محدود نہیں رہا ہے۔ ہر ثقافت اور زبان میں مقامی، علاقائی اور عقیدتی حالات کے مطابق یہ کام شروع ہوا ہے۔ لہٰذا، یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتب اور نسخ خطی کی ترمیم اور خراب شدہ یا ضائع شدہ حصوں کی بحالی ابتدائی مقاصد میں شامل رہی ہے۔

نسخ خطی کی حفاظت: ایران میں نسخ خطی کی بڑی تعداد ان قیمتی نسخوں کی حفاظت کے لیے بھاری ذمہ داری عائد کرتی ہے جو ان کی شناخت، حفاظت اور احیاء میں شامل ہیں۔ نسخ خطی کی حفاظت میں سب سے اہم نکتہ ان کا حصول ہے، یعنی پہلے ان نسخوں کو ان کے مالکوں سے حاصل کر کے حفاظت کے مراکز میں منتقل کیا جائے اور پھر ان کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لیے منصوبہ بندی کی جائے۔ بدقسمتی سے، بہت سے نسخ خطی غیر قانونی طریقوں سے ملک سے باہر لے جائے جاتے ہیں۔ یہ ناخوشگوار واقعہ اس لیے پیش آتا ہے کہ بعض نسخوں کے مالک ان نسخوں کی اہمیت سے واقف نہیں ہوتے یا پھر مالی فائدے کے لیے ان نسخوں کو ان دلالوں کو بیچ دیتے ہیں جن کا کام قدیم اور تاریخی اشیاء کی اسمگلنگ ہے۔

دوسری جانب، قدیم آثار کی حفاظت اور مرمت میں ہمیشہ یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ ان آثار کی اصل ترکیبات کیا ہیں۔ نسخ خطی کے حوالے سے بھی یہ نکتہ بہت اہم ہے۔ اصولاً، ایران میں نسخ خطی کی بڑی تعداد ان قیمتی نسخوں کی حفاظت کے لیے بھاری ذمہ داری عائد کرتی ہے جو ان کی شناخت، حفاظت اور احیاء میں شامل ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کئی منصوبے ترتیب دیے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک منصوبہ نسخ شناسی کے مختلف عناصر جیسے سیاہی، رنگ اور کاغذ کی علمی شناخت کے لیے تجربہ گاہوں کا قیام ہے۔ ان تجربہ گاہوں میں مختلف تجزیاتی آلات کے ذریعے ترکیبات کی شناخت کی جا سکتی ہے؛ لیکن اس راہ میں پہلا قدم کتابخانوں میں مطالعہ اور تحقیق ہے۔

تزئین نسخ خطی: نسخ خطی کی تزئین خطی نسخ کے مطالعاتی میدان میں ایک اہم موضوع ہے جو قاری کو مواد کی تزئین کے طریقوں اور ان کی اہمیت و اثرات سے آگاہ کرتا ہے۔ اگرچہ یہ موضوع بہت وسیع ہے، لیکن اس تحقیق میں نسخ خطی کی تزئین کے موضوع پر ایک مختصر نظر ڈالی جائے گی۔ مجموعی طور پر، نسخ

خطی کی تزئین کے دو اہم مباحث ہیں: .1 نسخ کی ظاہری تزئینات .2 نسخ میں استعمال ہونے والے مواد۔ ظاہری تزئینات میں نسخ کی حاشیے کی تزئین، خطاطی کے ساتھ موضوع کے مطابق نقش و نگار شامل کرنا شامل ہے۔ مواد کے استعمال کے حوالے سے، وہ مواد شامل ہیں جو کاغذ اور قلم کے رنگ کو خوبصورت بناتے ہیں۔ نسخ خطی کی تزئین میں استعمال ہونے والے مواد میں سے ایک زعفران ہے۔ "رسالات خوشنویسی میں نثر و نظم کے ذریعے مرکب بنانے میں زعفران کے استعمال کا ذکر کیا گیا ہے۔' دوسری جانب، قدیم آثار کی حفاظت اور مرمت میں ہمیشہ یہ مسئلہ پیش آتا ہے کہ ان آثار کی اصل ترکیبات کیا ہیں۔ اس کے علاوہ، یہ بھی توجہ دینا ضروری ہے کہ نسخ خطی کی تزئینات نہ صرف ان کو خوبصورت بناتی ہیں بلکہ ان کی مضبوطی اور پائیداری میں بھی مؤثر رہی ہیں۔

روش شناسی تصحیح نسخ خطی: نسخ خطی کی تصحیح کے لیے مختلف طریقے موجود ہیں جن میں قیاسی، التقاطی، تصحیح براساس نسخہ اساس اور روش بینابین شامل ہیں۔ جہانبخش نے ان میں سے ہر ایک طریقے کے بارے میں لکھا ہے:

** .1 تصحیح براساس نسخہ اساس**: اس طریقے میں متن کو اس کی سب سے اہم اور صحیح ترین موجودہ نسخہ، جسے "نسخہ اساس" کہا جاتا ہے، کی بنیاد پر تصحیح اور تحقیق کیا جاتا ہے۔

** .2 شیوہ تصحیح التقاطی**: یہ طریقہ عام طور پر اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کسی اثر کا مضبوط اور معتبر نسخہ دستیاب نہ ہو اور موجودہ نسخوں میں سے کوئی بھی اتنی صحت اور اصلیت نہ رکھتا ہو کہ اسے بنائے کار بنایا جا سکے۔

** .3 روش بینابین**: یہ طریقہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب نہ تو "نسخہ اساس" اتنا ممتاز ہو کہ اسے مبنا بنایا جا سکے اور نہ ہی اتنا کم اہم ہو کہ دیگر نسخوں کے برابر قرار دیا جا سکے۔

** .4 شیوہ قیاسی**: یہ طریقہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب اثر کا صرف ایک ہی نسخہ باقی ہو اور وہ بھی اتنا صحیح اور مضبوط نہ ہو۔ اس صورت میں اس نسخے کی بنیاد پر قیاس کیا جاتا ہے۔

ان مختلف طریقوں کا استعمال نسخ خطی کی تصحیح میں اس کی موجودہ حالت اور صحت کے مطابق کیا جاتا ہے، تاکہ زیادہ سے زیادہ درست اور معتبر متن فراہم کیا جا سکے۔ اگر نسخ خطی کی اہمیت کو صحیح طور پر سمجھا جائے تو انہیں قیمتی خزانے کی طرح محفوظ رکھا جائے گا؛ کیونکہ حقیقت میں نسخ خطی کسی بھی قوم کا ثقافتی سرمایہ اور پشتوانہ ہیں جو آئینے کی طرح اس قوم کی تاریخ، دانائی، فن اور دیگر شناختی خصوصیات کو منعکس کرتے ہیں۔ اصولاً، نسخ خطی کی تصحیح کی اہمیت ان کی تاریخی اہمیت کی وجہ سے ہے؛

لہٰذا جتنا زیادہ نسخہ قدیم ہو اور مؤلف کی زندگی کے زمانے کے قریب ہو، اتنا ہی زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ اگرچہ مضمون اور مواد بھی نسخ خطی کی قدر و قیمت کے معاملے میں بہت اہم ہیں، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان قیمتی خزانوں کی درست اور واضح قیمت نہیں لگائی جاسکتی اور کسی کو کم قیمت یا بے قیمت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

کتابیات:

۱۔اھمیت نسخ خطی وتصحیح روش مند آنھا سیدہ الھام الھام بخش، احمد طحانی
۲۔ بررسی عناصر فہرست نویسی نسخہ ھای خطی وتعارف آنھا۔حسن علی فریدونی، مرجان علی
۳۔نسخ خطی، تعارف اصطلحات۔دکتر علی اکبر ضیایی
۴۔نسخہ جات بشیر الدین عصری

☆☆☆

Masnavi " Pas cha Bayad Kard ma Musafir by Junaid Hussain

(Research Scholar dept. of Persian, Kashmir University,Srinagar)
جنید حسین (ریسرچ اسکالر شعبہ فارسی کشمیر یونیورسٹی حضرت بل سرینگر)

مثنوی" پس چہ باید کرد مع مسافر"

ای نام تو بہترین سرآغاز بی نام تو نامہ کی کنم باز

مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر شاعر مشرق علامہ اقبال کی شاہکار تصنیف ہے۔ اقبال نے خودی کے ذریعے قوم وملّت کو درس دیا۔ انہوں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں اپنا کلام یادگار چھوڑا۔ ان کی تصانیف میں بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم، زبور عجم، جاوید نامہ اور مثنوی پس چہ باید کرد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ علامہ اقبال مولانا روم سے بہت متاثر تھے اور ان کو اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے جس کے لئے وہ لکھتے ہیں۔

پیر رومی مرشد روشن ضمیر کاروان عشق ومستی را امیر

مولانا روم نے نی یعنی بانسری کے زریعے لوگوں کو درس دیا اسی طرح اقبال نے خودی کے ذریعے لوگوں کو بیدار کرنے کی پوری کوشش کی۔ اقبال لکھتے ہیں۔

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب ہم زخدا خودی طلب ہم زخودی خدا طلب

علامہ اقبال نے عشق کو بالاتر مقام سے نوازا ہے اقبال عشق کو امام اور عقل کو غلام لکھتے ہیں:

من بندہ آزادم عشق است امام من عشق است امام من عقل است غلام من

اقبال اس مثنوی کی شروعات کرنے سے قبل اس کے پڑھنے والے سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں کہ میں عشق کی مملکت سے ایک نیا لشکر حرکت میں لا رہا ہوں اسلئے کہ حرم میں عقل کی بغاوت کا خطرہ ہے زمانہ جنون اور عشق کی اصلیت سے بے خبر ہے حالانکہ جنون ایک ایسا لباس ہے جو عقل ہی کے جسم کے لئے موزون ہے اور جب میں نے وہ لباس یعنی عشق کا لباس پہنا تو اس مقام پر پہنچ گیا جہاں عقل کے لئے میرے بام ودر کا طواف کرنا خوشبختی کی علامت بن گیا۔ اقبال نے اس مثنوی کی تمہید کی شروعات مولانا روم سے کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

پیر رومی مرشد روشن ضمیر کاروان عشق و مستی را امیر
منزلش برتر ز ماہ و آفتاب خیمہ را از کہکشان سازد طناب

پیر رومی ایک روشن ضمیر مرشد ہیں جو عشق و مستی کے قافلہ کے سالار ہیں ان کا مقام و مرتبہ چاند اور سورج سے بلند تر ہے اور اس بلندی کا عالم یہ ہے کہ وہ اپنا خیمہ نصب کرنے کے لئے کہکشان سے رسی کا کام لیتے ہیں۔ اقبال لکھتے ہیں کہ مولانا نے نی کے ذریعے میرے دل میں ہنگامہ پیدا کیا۔ انہوں نے مشرق کو نئے ولولے عطا کئے اور غلامی کی بیڑیاں کھولی یعنی انہوں نے لوگوں کو بیدار کیا جس وجہ سے اہل مشرق غلامی کی زندگی سے نجات حاصل کرنے لگے۔ اقبال نے اس مثنوی میں خیر و شر کی پہچان کرنے کی تلقین بھی کی ہے جس کے لئے خدائ عزّوجل نے بھی کہا ہے 'فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ'۔ اقبال لکھتے ہیں کہ مومن خیر اور شر کا امتیاز کرنا جانتا ہے۔ یہ دور عشق حقیقی سے بالکل بے خبر ہے اور اس میں الجھے ہوئے لوگوں کے کانوں میں ایک عاشق کی نالہ وزاری ایسے ہی ہے جیسے دریا فرہنگ میں کوئی مسلمان آزان دے۔

تمہید کے بعد دنیا کو روشن کرنے والے سورج سے خطاب 'خطاب بہ مہر عالمتاب' ہو کر لکھتے ہیں اے مشرق کے سالار اے روشن سورج تو ہر ذرے کے باطن تک کو روشن کرنے والا ہے۔ اس کائنات میں جو سوز و سرور ہے وہ تیرے ہی دم سے ہے اور تجھ ہی سے ہر پوشیدہ شے میں اپنے اظہار کا ذوق ہے۔

ای امیر خاور ای مہر منیر می کنی ہر ذرّہ را روشن ضمیر
از تو این سوز و سرور اندر وجود از تو ہر پوشیدہ را ذوق نمود

سورج کی مختلف صفات اور خوبیاں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تیری وجہ سے چاند جو چاندنی اور پتھر کے اندر لعل کو چمک ملتی ہے تو میری سیاہ خاک یعنی اقبال کو منور کر دے تا کہ میں مشرق کے افکار کی رات کو دن میں بدل سکوں۔

حکمت کلیمی کا تذکرہ کرتے ہوئے اقبال نبوت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ نبوت جب احکام الٰہی کا اجرا کرنے لگتی ہے تو شاہی احکام کو ٹھکرا دیتی ہے، نبوت یا نبی کا پیغام صرف اللہ کی ذات سے متعلق ہوتا ہے، نبوت ایک ایسی حکمران ہے کو تخت و تاج سے بے نیاز ہے۔ اسی طرح حکمت کلیمی کے لئے لکھتے ہیں کہ یہ عاجزوں اور بے نواؤں کو بیدار زندگی کا پیغام دیتے ہوئے کہتی ہے کہ اٹھو اور پرانے معبود کا نام و نشان مٹا دو۔ ای مومن تو اس پرانے فرسودہ بت کدہ کا توڑ 'ربی الاعلیٰ' سے کر۔

بندہ درماندہ را گوید کہ خیز ہر کہن معبود را کن ریز ریز
مرد حق افسون این دیر کہن از دو حرف 'ربی الاعلیٰ' شکن

حکمت کلیمی کے بعد حکمت فرعونی کا تذکرہ کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں میں نے اہل دین کی حکمت ظاہر کردی ہے اب باطلوں فرعونیوں کی حکمت کی وضاحت کر رہا ہوں۔ایسی قوم زندگی میں عیش وعشرت کو اپنا مرکز بناتی ہے،موت سے ڈرتی ہے،اس قوم کی بیٹیاں اپنی ہی زلفوں کی اسیر ہو جاتی ہیں اور ایسی قوم کے جوان عورتوں کی طرح اپنے جسم کی آرایش میں مصروف رہتے ہیں ۔ فرعونیوں کی پہچان کروانے کے بعد لا الہ الا اللہ کی فضیلت اور اہمیت بیان کرتے ہیں۔

در جہاں آغاز کار از حرف لاست این نخستین منزل مرد خداست

بعد از این اقبال فقر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اے لوگو کیا تمہیں معلوم ہے کہ فقر کیا ہے، فقر نام ہے ایک راہ بین نگاہ اور ایک زندہ دلی کا،فقر اپنے آپ کو جانچنے ، پرکھنے اور لا الہ کے دو الفاظ کو خود پر طاری کرنے کا نام ہے،فقر خیبر فتح کرنے والا ہے،فقر ذوق شوق کی کیفیت کا نام ہے،رسول ﷺ کی میراث ہے اور مومن کا فقر کائنات کی تسخیر ہے اسی کی بدولت ایک غلام میں آقا کی سی صفات پیدا ہو جاتی ہیں اور کافر کا فقر کیا ہے؟ دشت میں اس کا تنہائی اختیار کرنا ہے۔

فقر مومن چیست؟ تسخیر حیات بندہ از تاثیر او مولا صفات
فقر کافر خلوت دشت و دراست فقر مومن لرزۂ بحر و براست

فقر کے بعد اقبال نے آزاد مرد یعنی 'مرد حر' کا تذکرہ کیا ہے لکھتے ہیں کہ آزاد مرد جفاکش اور سخت کوش ہوتا ہے ، جب خدا کی راہ میں چلتا ہے تو قوی ارادے سے چلتا ہے کبھی بھی تکلیفون اور پریشانیوں سے نہیں گھبراتا اور مرد حر رسول ﷺ کے دست مبارک سے پیالہ پینے والا ہے۔

ما کلیسا دوست، ما مسجد فروش اوز دست مصطفی پیمانہ نوش

مرد حر کے ذکر کے بعد اقبال شریعت کے رازون کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

نکتہ ہا از پیر روم آموختم خویش را در حرف او واسوختم
مال را گر بہر دین باشی حمول نعم مال صالح گوید رسولؐ

میں نے مولانا روم سے بہت گہری باتیں سیکھی ہیں اور ان کی باتوں سے خود میں سوز پیدا کیا۔رومی رسولؐ کی حدیث کے حوالے سے لکھتے ہیں اگر تو مال کو دین کی خاطر جمع کرے گا تو حضورؐ کا ارشاد ہے ایسا مال صالح ہے اور یہ مال جائز اور حلال کمائی سے ہو۔اس طرح دین کے بارے میں

مختلف چیزین بیان کرنے کے بعد اہل ہند کے نفاق پر چند آنسو یعنی 'اشکی چند بر افتراق ہندیاں'

ای ہمالہ، ای اطک، ای رود گنگ زیستن تا کی چنان بی آب و رنگ

پیر مردان از فراست بی نصیب نوجوانان از محبت بی نصیب

اے ہمالیہ پہاڑ، اے اٹک اور اے دریا گنگا تمہارا اس قسم کا جینا کب تک جبکہ یہاں کے بوڑھے آدمی شعور سے محروم اور نوجوان محبت اور یگانت سے بے بہرہ ہیں۔ مشرقی اور مغربی ممالک آزاد ہیں لیکن ہماری گردنوں میں غلامی کا حلقہ ہے۔ بعد ازیں موجودہ دور کی سیاست کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس دور کی سیاست غلاموں کی غلامی کے بندھن کو کچھ زیادہ ہی مضبوط کر دیتی ہے اسلئے لوگو اب آپ کو آزادی کی خواہش ہے تو ان سیاستدانوں کے فریب میں نہ آنا۔ ان سے دور رہو ان وقت کے فرعونوں کے سامنے حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے انداز میں بات کرو اور نعرۂ حق بلند کرو، ہمت اور جرئت سے کام لو تا کہ غلامی سے نجات حاصل کر سکو۔

پیش فرعونان بگو حرف کلیم تا کند ضرب تو دریا را دو نیم

اس کے بعد حرفی چند با امت عربیہ کا تذکرہ کیا ہے اقبال لکھتے ہیں اے عرب کہ خدا کرے تیرے دشت و صحرا اور درّے ابد تک قائم رہیں کیونکہ لا قیصر اور کسری کا نعری کس نے بلند کیا، زمان و مکان کی حامل اس دنیا میں قرآن کریم کا اولین قاری کون تھا۔ اسی امّی لقب کے سیراب کرنے والے کے دم سے عرب کے صحرا کی ریت میں لا الہ کے پھول کھل اٹھے یعنی بڑے بڑے علما، حکما اور فقیر پیدا ہوئے، میدان جنگ میں نماز کی آزان کی ہیبت ہو یا جنگ کے دوران سورۃ الصفت کی قرآت ہو سب رسولؐ کی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ جنگ بدر اور جنگ غزوہ حنین کی گرمی ہو یا حضرت حیدر کرار ہوں، ابوبکر صدیق ہوں، عمر فاروق ہوں یا امام حسین ہوں سب رسولؐ کی شخصیت و کردار اور تعلیمات کے عکس کے حامل ہیں۔

گرمی ہنگامہ بدر و حنین حیدر و صدیق و فاروق و حسین

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق لکھتے ہوئے اقبال فرماتے ہیں انسانیت فرنگیوں کے ہاتھوں نالان ہوئی زندگی نے ان سے ہنگامہ حاصل کیا یا ان کی عیاری کے باعث زندگی صیح جوش و جذبہ ہی سے عاری ہوگئی۔ انسان جو رنگ و نسل کے معاملوں میں الجھ کر رہ گیا اس کے لئے بھی اقبال نے لکھا ہے اللہ تعالیٰ خود قرآن میں فرماتا ہے بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا فرمایا ہے:

لقد خلقنا الانسان فی احسان تقویم پھر بھی انسان رنگ ونسل کی الجھنون کا شکار ہوکر رہ گیا اقبال لکھتے ہیں کہ اے مسلمان تو جو رنگ ونسل کا اسیر ہے اس کے چکر سے آزاد ہوجا اور مشرق کی پرانی قوموں کی شیرازہ بندی کر اور صدق وصفا کا پرچم بلند کر ۔

ای اسیر رنگ پاک از رنگ شو مومن خود کافر افرنگ شو
این کہن اقوام را شیرازہ بند رایت صدق وصفا را کن بلند

اسی طرح اقبال رسالت مآب کے تذکرہ میں لکھتے ہیں اے حضورؐ آپ ہم نے کسوں کا بہت بڑا سرمایہ ہیں اس قوم کو موت کے ڈر سے نجات دلایئے ۔آپ نے سب پرانے بت جلا دیئے پاش پاش کردیئے اور پرانی اور فرسودہ کائنات کو نئی زندگی عطا کی اور مشرکانہ اور کافرانہ رسومات ختم کرکے توحید کی طرف لایا۔

ای تو مایچارگان راساز وبرگ وا رہان این قوم را از ترس مرگ
سوختی لات و منات کہنہ را تازہ کردی کائنات کہنہ را

اس طرح شرح مثنوی مسافر میں نادرشاہ کا ذکر کرتے ہوئے اسکی خوبیان اور صفات ، افغانستان کی سرحد پر بسنے والی قوموں،قبیلوں سے خطاب کے بعد اقبال کا شہر کابل میں داخل ہونے کا ذکر اور اعلیٰ حضرت شھید یعنی نادرشاہ کے حضور حاضر ہونے کا ذکر بھی شاعر نے باخوبی کیا ہے شہر کابل کے بارے میں لکھتے ہیں۔

شہر کابل خطۂ جنت نظیر آب حیوان از رگ تاکش بگیر
چشم صائب از سوادش سرمہ چین روشن و پایندہ باد آن سرزمین

اس کے بعد بابر کے مزار کی حاضری کا ذکر،غزنہ کا سفر اور حکیم سنائی کے مزار پر حاضری و زیارت کا ذکر بھی اقبال نے کیا ہے۔

ای حکیم غیب امام عارفان پختہ از فیض تو خام عارفان

روح حکیم سنائی از بہشت برین جواب می دہد کہ میں سنائی فقر کی بدولت خیر وشر کا رازدان بن گیا اور فقر کی بدولت میں زندہ اور صاحب نظر ہوگیا وہ فقر جو راہ خدا سے واقف ہے اور نور خودی س ءاللہ کو دیکھتا ہے اس سے ہٹ کر کوئی فقر نہیں ہے۔

رازدان خیر وشر گشتم ز فقر زندہ وصاحب نظر گشتم ز فقر
یعنی آن فقری کہ داند راہ دا بیند از نور خودی اللہ را

اس کے بعد بر مزار سلطان محمود پر حاضری کے ذکر کے ساتھ ساتھ غزنی کے ویرانے میں اس دیوانے کی مناجات، ذکر قندھار و زیارت خرقۂ مبارک، غزل

از دیر مغان آیم بی گردش صہبا مست در منزل لا بودم از بادۂ الا مست

کے بعد احمد شاہ بابا موسس ملت افغانیہ، ظاہر شاہ پادشاہ سے خطاب کرنے کے ساتھ اقبال نے اس مثنوی کا خاتمہ کیا ہے اس کا خاتمہ کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں کہ میرا سینہ لا الہ کی روشنی سے منور ہے میری شراب میں لا الہ کا کیف وسرور ہے اور اسی فیض سے میری میری فکر آسمان پر پرواز کر رہی ہے اور اسی سے میری ندی بیکران ہے۔ سو تو مجھ سے میری شراب کے دو ایک جام لے تاکہ تو ننگی تلوار کی طرح چمک اٹھے، سچا عاشق بن میرا سرمایہ بھی عشق حقیقی ہے اسلئے تو بھی اسی کا پیروکار بن جس سے تیری دنیا ور آخرت اچھی ہوجائے گی تجھ میں ایسی قوت اور طاقت پیدا ہو جائے گی جس کے سامنے بڑی سے بڑی باطل طاقت نہ ٹھہر سکے گی۔

دارم اندر سینہ نور لا الہ در شراب من سرور لا الہ
فکر من گردون میسر از فیض اوست جوئی ساحل ناپذیر از فیض اوست
پس بگیر از بادۂ من یک دو جام تا درخشی مثل تیغ بی نیام

کتابیات

۱:۔ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، شرح مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر، تاجران کتب، ۲۰۱۶۔
۲:۔سید سلام ندوی، اقبال کامل، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، ۱۹۸۹۔
۳:کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، اشاعت چہارم ۱۹۸۱۔
۴: پروفیسر یوسف سلیم چشتی، مثنوی پس چہ باید کرد و مسافر مع شرح، نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۔۱۹۷۷۔
۵: پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شرح زبور عجم، عشرت پبلشنگ ہاؤس،۔ ۱۹۵۳۔
۶: نورالحسن انصاری، اقبال: شاعر و مفکر ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔

☆☆☆

نظمیں Nazmein

Parvin Shere (USA)
پروین شیر (امریکہ) cell-001-650-656-5271

بے پایاں Endless

سورج اوڑھے تپتی ریت پہ چلتے رہنا
چلتے چلتے
منہ کے بل گر کر اٹھ جانا
کپڑے جھاڑ کے
چہرے مہرے سے مٹی اور گرد ہٹا کر
زخمی تلووں پر پھاہا رکھ کر، ریتیلی
لمبی، تپتی پگ ڈنڈی پر
چلنا، گرنا، اٹھنا، چلنا
پھر گر جانا۔۔۔!

☆☆☆

(2)

نسیان Alzheimers

بے بسی کی ردا میں
بھٹکتی ہوئی زندگی
اپنے جذبوں کے سیلاب میں
اس طرح ڈوبتی اور ابھرتی رہی
زنگ آلود تالے سے جکڑے ہوئے
ذہن پر زور چلتا نہیں
زندگی کا مرتب صفحہ
پرزہ پرزہ جو اڑتا بکھرتا رہا
سارے الفاظ
اک دوسرے سے جدا ہو گئے
کوئی تحریر بنتی نہیں
دستکیں دیں تو دروازہ کھلتا نہیں
یادکا ریزہ ریزہ ورق
لے گئیں آندھیاں
حافظے کی سبھی چابیاں
راستوں میں کہیں گر گئیں
سارے دروازے اب بند ہیں
دستکیں دیں تو دروازہ کھلتا نہیں

☆☆☆

(3)

کہیں ایسا نہ ہو جائے

ہراساں، دل گرفتہ کیوں
تھکی نظروں سے تکتے خلاؤں میں؟
نمی پلکوں پہ ہے، بیٹھے ہو کب سے تم اندھیروں میں
چلو آؤ۔۔۔
نچوڑ و وقت کے مہتاب سے قطرے اجالوں کے
یہ تیرہ بخت جاں کا سوکھتا پودہ
دوبارہ لہلہا اٹھے
قدم یہ ڈگمگاتے ساتھ دیں جب تک
چلو چل کر پکڑ لو ایک اک لمحے کی
اڑتی تتلیاں لرزیدہ ہاتھوں سے
کہیں ایسا نہ ہو جائے
کہ آنکھوں پر بہاریں رنگ برنگے پھول رکھیں اور
بصارت دھند کی دیوار کے اندر مقید ہو
لرزتی انگلیاں ترسیں قلم کے لمس کو لیکن
اٹھا پائیں نہ بوجھ اس کا
شجر کی شاخ پر گونجیں محبت کے مدھر نغمے
مگر خستہ سماعت کے دریچے بند ہو جائیں
نحیف و ناتواں یہ پاؤں اور یہ
دھند میں ڈوبی ہوئی نظریں
یہ گم ہوتی سماعت، یہ لرزتی انگلیاں جانے
کہاں، کس موڑ پر آ کر
اجازت مانگ لیں تم سے

☆☆☆

(4)

یکتا Unique

ملکوں ملکوں شہروں شہروں
قریہ قریہ ہر رستے پر
نازاں، فرحاں وہ چلتے ہیں
فتح کے جگنو ہر مٹھی میں
راحت کے سیم و زر سے سرشار یہ روحیں
اک پیکر کی تہہ میں پوشیدہ ہیں جانے
کتنے آڑے ترچھے پیکر
رستے کے ہر پیچ و خم پر
اک ظاہر ہوتا ہے باقی چھپ جاتے ہیں

اس جمگھٹ میں
رواں، ہراساں، اشک بداماں
ژولیدہ مو
خوابوں کی سازش میں الجھا
ٹھوکر کھانا
محرومی کی آنچ میں تپتا
ایک اکہرا پیکر ہے جو
ناکامی کے
گہرے دلدل کے جبڑوں میں
قید ہوا ہے۔۔۔!

☆☆☆

Aslam Imadi (USA)
اسلم عمادی (امریکہ) cell-001-732-207-9739

Razmiya ka Dard رزمیہ کا درد

سفیدی کے کاغذ پہ میں
رزمیہ کی کہانی تو لکھتا نہیں ہوں
مگر یہ بھی سچ ہے
کہ کل جب سویرے کی آنکھیں کھلی تھیں
تو ہر اک طرف
خون ہی خون تھا
ذہن کے گھونسلوں میں پرندے
بہت ڈر گئے تھے
مکانوں کے سر پہ کفن سرخ تھا
اندھیری ہواؤں کی آوارہ لہریں
ہر اک سبز پیکر پہ خونی فسانہ سنبھالے ہوئی تھیں
مگر آج جب
روشنی ٹوٹ کر آ گری ہے
تو اب عکس میں خوں کی رنگت نہیں ہے
تو اب خون آنسو بنا ہے۔!!

☆☆☆

Pahla Harf پہلا حرف

ابھی تو
میں نے اپنے نام کا
پہلا حرف ہی لکھا ہے
ابھی تو
میرا رنگ سنگِ شہرِ خواب
میں چھپا ہے
ابھی تو
نرم نرم ہونٹ پٹریوں کی وحشتوں سے
زخمِ ہائے دلخراش سے ملے نہیں
ابھی تو
پھول سی کٹوریوں میں شبنمی خبر ہے
صبح کی اداسیوں کی زردیاں نہیں
ابھی تو
خواب دیکھ لیں
اپنے نام کے ہر ایک حرف کو خوشنمائی سے لکھیں

☆☆☆

Khalid Jamal (Varanasi)
خالد جمال (وارانسی) cell-9838202248

نمودِ نو Numood-e-Nav

زمیں کی خاک میں بہتے
لہو میں
ہوا کا زہر
گھلتا جا رہا ہے
جلن
سانسوں میں
بڑھتی جا رہی ہے
فصیلِ خواب
ڈھہتی جا رہی ہے
کہ اب
بنیاد
ہلتی جا رہی ہے
چلو
اس خاک کو
رکھ دیں چتا پر
کہ جل کر
بھسم ہو جائے
مگر، پھر
راکھ کو
گنگا کا پانی
بہا لے جائے گا
کھیتوں کی شہ رگ تک
تو پھر
اس جسم کو نذرِ زمیں کر دیں
کہ سارا زہر
خود میں جذب کر لیں
کسی سبزے کی صورت
پھر نمو ہو
درونِ خاک
دریائے لہو میں

☆☆☆

یقینِ کامل Yaqeen-e-kamil

ہم نے جاڑے کی سرد راتوں میں
اپنے جذبوں کی آگ بھڑکائی
جسم و جاں کو حرارتیں بخشیں
اس حرارت کا پیش خیمہ ہے
صبحِ نو کا یقینِ کامل ہے
سارا وہم و گمان باطل ہے

☆☆☆

Mahamrityunjay Mantr by Vijay Kumar "Zahid" Abrol (Una)

وجئے کمار زاہدؔ ابرول (اونا) cell-9816643939

مہا مرتیونجے منتر

مہامرتیونجے منتر کوتریمبکم منتر یا رودر منتر بھی کہا جاتا ہے۔اسے رشی منیوں نے وید کی روح بھی کہا ہے، کیوں کہ تینوں ویدوں میں اس منتر کا ذکر ہے۔رگ وید کے 7 ویں منڈل کے 59 ویں سوکت کا بارہواں منتر، یجور وید کے تیسرے منڈل کے 60 ویں سوکت میں اور اتھروید کے 14 ویں منڈل کے پہلے سوکت میں ساتواں منتر یہی منتر ہے۔رگ وید کے جس حصے میں یہ منتر ہے،اس حصے کی تخلیق مہارشی وششٹ نے کی ہے،اسی لئے مانا جاتا ہے کہ بھگوان شِو نے خود اس منتر کو سنجیونی منتر کہہ کر رشی شکر کو زندگی بحال کرنے کے علم کی صورت میں وردان دیا تھا۔کسی کسی جگہ اسے رشی مارکنڈے کے مہامرتیونجے ستوتر کے ساتھ جوڑ کر انہیں اس منتر کا خالق بتایا گیا ہے۔اس منتر میں بھگوان شِو کو قضا کا فاتح اور مغفرت بخش مانتے ہوئے ان سے حیات وموت سے نجات دلوانے کی گزارش کی ہے۔

کسی بھی مصیبت یا حادثے کو ٹالنے کے لئے اِس منتر کا وِرد (جاپ) کیا جاتا ہے۔

Om trayambakan yajamahe sugandhin pushti vardhanam
Urvarukmiv bandhnanmrityormuksheey maamrataat

ترجمہ:

ہم اپنے معبود و پرورندہ وہ چشمِ ثلثہ سے بس یہ مانگیں
ثمر جدا جیسے شاخ سے ہو، یوں موت سے ہم نجات پائیں

☆☆☆

غزلیں Ghazlein

Rafeeq Raaz (Srinagar)
رفیق راز (سرینگر) cell-7889968878

موجود کوئی ہو کہ نہیں ہو خدا تو ہے
اک گل یقیں کا شک کے چمن میں کھلا تو ہے

روشن ہوا کے سامنے شمع انا تو ہے
تاریکیوں میں ایک ذرا سی ضیا تو ہے

آتی کسی طرف سے نہیں تیری ہی صدا
دروازہ ورنہ میری سماعت کا وا تو ہے

ہوتا ہے کب ظہور مناظر کا دیکھئے
آنکھوں سے میری دھند کا پردہ ہٹا تو ہے

یہ خاک تر اڑی نہ ہماری اگر تو کیا
ہر پتہ احترامِ ہوا میں ہلا تو ہے

کب ٹوٹتی ہے دیکھئے بے حس زمیں کی نیند
ہم نے فلک کو سر پہ اٹھایا ہوا تو ہے

آثار دن کے دشت کے ظاہر نہیں ہوئے
شب کا پہاڑ پلکوں سے کاٹا گیا تو ہے

☆☆☆

(2)

جب تک رہی تھی زیر قدم مٹی گاؤں کی
تب تک رہی تھی بند زباں بھی کھڑاؤں کی

آنکھوں میں اس کے عکس عجب منظروں کے تھے
کپڑوں پہ اس کے خاک تھی چاروں دشاؤں کی

سڑکیں پرانی ہیں کہ نئی مجھ کو اس سے کیا
میرے لئے تو سب ہیں یہ زنجیریں پاؤں کی

تو کیا کسی روایتی معشوق سے ہے کم
ہے داستاں طویل تری بھی جفاؤں کی

نرغے میں آچکا تھا مرا خیمۂ سکوت
چاروں طرف سپاہ کھڑی تھی صداؤں کی

اشجار کچھ سخی تھے تری رہگزار کے
دولت لٹارہے تھے سر راہ چھاؤں کی

اشکوں سے اپنی خاک رکھو تر رفیق راز
نیت بگڑ بھی سکتی ہے دیکھو ہواؤں کی

☆☆☆

(3)

صورت برگ کبھی رقص کرایا ہے مجھے
صورت رنگ کبھی گل سے اڑایا ہے مجھے

ہاتھ میں جس کے ہے منہ زور ہواؤں کی باگ
خاک کے تخت پہ اس نے ہی بٹھایا ہے مجھے

جو کسی آنکھ سے رکھتا ہے علاقہ ہی نہیں
شعبدہ گر نے وہ منظر بھی دکھایا ہے مجھے

اپنے رخ پر بھی نمودار میں ہوتا ہی نہیں
کس سیہ خانہ باطن میں چھپایا ہے مجھے

تو نے آنکھوں سے مری نیند چرا کر جاناں
میرے ہم زاد سے ہر رات لڑایا ہے مجھے

کس نے ڈالا ہے خلل یہ مری تنہائی میں
کس نے آ کر یہ بھلا مجھ سے چھڑایا ہے مجھے

مدتوں بعد ہوا طاق میں روشن یہ چراغ
مدتوں بعد خیال آپ کا آیا ہے مجھے

☆☆☆

(4)

سر ہی عدو کا جھک گیا جب احترام سے
شمشیر پھر نکالتا میں کیا نیام سے

بجتی اگر ہے اینٹ یہاں اینٹ سے تو کیا
ٹکراتے جام بھی تو ہیں ہر روز جام سے

ویرانیاں وہ ہجر کی حجرے میں اب کہاں
میلہ لگا سا رہتا ہے یادوں کا شام سے

سیراب مجھ کو پیاس میں کرتا ہے یہ سراب
سرشار کرتی ہیں وہ چٹانیں کلام سے

کرنا ہے اس مقام سے مجھ کو سفر شروع
آگے نہیں مقام کوئی جس مقام سے

یہ لوگ میرے کام سے واقف نہیں تو کیا
یہ لوگ جانتے ہیں مجھے میرے نام سے

☆☆☆

(5)

لگتا ہے اک گلاب سا کوئی کھلا ہوا
وہ نقش پا جو اب ہے قریباً مٹا ہوا
کس خیمۂ سکوت میں ہم ہیں پنہہ گزیں
سانسوں کا ایک حشر ہے اس میں اٹھا ہوا
ہؤ کے چمن میں آنکھ تھی حیرت زدہ مری
شعلہ تھا نخل آب پہ پھل سا لگا ہوا
آتی ہے موج صرصر وحشت کہاں سے روز
گھر سے مرے ہے کیا کوئی صحرا لگا ہوا
مجھ پر ہی آ گرے نہ کسی دن یہ خوف ہے
اک بے طناب خیمہ ہے سر پر تنا ہوا
اب مجھ سے گونجنے لگی ہیں وسعتیں تمام
میرا سکوت نغمۂ ارض و سما ہوا
اس میں بھی روشنی کے سمندر تھے موجزن
وہ جو دھواں تھا میرے دئے سے اٹھا ہوا
کرنا یہاں سے ہے تن تنہا ہی اب سفر
یہ کون سا مقام ہے سایا ہوا ہوا
وہ روشنیٔ دیدۂ اہل نظر کہاں
منظر سے ایک رنگ وہی ہے اڑا ہوا
رستہ نیا ہو اور نئی ہوں صعوبتیں
مجھ کو سفر قبول نہیں ہے کیا ہوا

☆☆☆

(6)

کچھ سوجھتا نہیں ہے اب اس انتشار میں
پاگل ہوا کا رقص ہے جاری غبار میں
ملبوس ہیں یہ پیڑ نئے برگ و بار میں
دونوں طرف کھڑے ہیں ترے انتظار میں
آثار شہر جسم کے موجود ہیں ابھی
اک شور سا ہے روح کے قرب و جوار میں
موج ہوائے زرد سے ڈرتا وہ کیا بھلا
خوشبو کے نشے میں تھا ابھی گل بہار میں
معنی ہوں مثل خوشبو ہی آزاد کر مجھے
دم گھٹ رہا ہے حرف ادق کے حصار میں
میں آگے اور سایہ تھا پیچھے مرے مرا
سورج کے روبرو تھے ہمی دو قطار میں
اب کے تو زرد رت وہ اجالا نہ کرسکی
اب کے لگی نہ آگ کسی بھی چنار میں
کس تابکاری سے یہ چٹانیں پگھلتی ہیں
کس آفتاب نے یہ کیا گھر ہے غار میں
آندھی چلی ہے دشت میں یہ کیا ضرور ہے
ممکن ہے قافلہ ہی کوئی ہو غبار میں

☆☆☆

Khurshid Akbar (Patna)
خورشید اکبر (پٹنہ) cell-9631629952

منافقوں کا اگر کاروبار ٹوٹے گا
مجاہدوں پہ ستم کا شمار ٹوٹے گا
میں سر جھکائے ہوئے مصلحت سے لڑتا ہوں
یہ سر اٹھا تو ترا اختیار ٹوٹے گا
میں دانے دانے کو محتاج ہو کے بھٹکوں گا
اسی ملال میں پرور دگار ٹوٹے گا
اب اس کے ہاتھ سے ہیں منہ کے فاصلے کوسوں
سند کا بوجھ لئے ہونہار ٹوٹے گا
ہر ایک اینٹ سے مجبوریاں ٹپکتی ہیں
نہ جانے کب یہ سسکتا دیار ٹوٹے گا

(2)

دکھاؤں درد کسے داشتہ مرادوں کا
تمام شہر کھلونا ہے شاہ زادوں کا
وزیر قید ہوا ،اب تو شہہ کی باری ہے
بڑھا چڑھا ہے مگر حوصلہ پیادوں کا
نصیب پیٹتی یرقان رنگ بستی میں
یہ کس کے ہاتھ مہورت ہے سبز وعدوں کا
بساطِ خواب ! تجھے ٹاٹ تک نصیب نہیں
یہ کیا صلہ ہے ترے ریشمی ارادوں کا
تصورات سے عاری ہے اگنی دل کی
کہیں تو ذکر چلے بھیگتے لبادوں کا

☆☆☆

(3)

عدو بھی قد کے برابر نکلنے والا ہے
مرے خلاف برادر نکلنے والا ہے
لہو پہ کس نے سفیدی کی تہمتیں رکھیں
وہ دیکھ !سرخ کبوتر نکلنے والا ہے
میں ریگ زار کی دریا دلی سے واقف ہوں
ٹھہر! یہاں سے سمندر نکلنے والا ہے
تعلقات کی خوش فہمیوں سے پوچھوں کیا
کس اعتماد پہ خنجر نکلنے والا ہے
میں بن کے آئینہ بیٹھا ہوں بیچ رستے میں
کہ اس طرف سے سکندر نکلنے والا ہے
دیارِ صبر کا ملبہ ہٹا کے دیکھ ذرا
یہیں کہیں پہ مرا گھر نکلنے والا ہے
اک ایک عکسِ مروت سنبھال کر رکھنا
پلک جھپکتے یہ منظر نکلنے والا ہے
کہیں یہ خاص علاقہ تو سرمدوں کا نہیں
قدم قدم پہ یہاں سر نکلنے والا ہے
تمہیں خبر بھی ہے کچھ حسرتِ عظیم آباد
تمہاری خاک سے اکبرؔ نکلنے والا ہے

☆☆☆

Pawan Kumar (IAS) Lucknow
پون کمار (لکھنو) cell-9412290079

کہاں تک ہمیں زندگی رد کرے گی
کہیں پر تو قائم کوئی حد کرے گی
یہی سوچ کر زندگی سے خفا ہیں
کسی دن ہماری خوشامد کرے گی
ہے بینائی اس کی اسی کے مناظر
وہ چاہے گی جس کو ندارد کرے گی
بدل جائیں گے سارے کردار کے رخ
کہانی میں جس دم وہ آمد کرے گی
مجھے جبکہ واپس بھی آنا نہیں ہے
مرا انتظار اب وہ شاید کرے گی

(2)

میں سازش حیات کو کس طرح کم کروں
تنہائیوں میں بیٹھوں کہ آنکھوں کو نم کروں
حرص و ہوس کے ساتھ بھی فانی ہے زندگی
کیا اس کے واسطے کوئی ساماں بہم کروں
بڑھنے لگا ہے سلسلہء اعتماد پھر
اس سلسلے کو اور بڑھاؤں کہ کم کروں
تو پھر سے آ گیا ہے مری زندگی میں دوست
اس بات کا میں لطف اٹھاؤں کہ غم کروں
مقصد ہے مرے سامنے اپنی شناخت کا
پھر کس لئے ہجوم کو میں ہم قدم کروں

☆☆☆

(3)

اس دل کی فرمائش ہے تو
ایک ادھوری خواہش ہے تو
تجھ کو پانا مشکل تو ہے
پھر بھی دل کی کاوش ہے تو
ہر شئے میں تو ہی شامل ہے
اپنے آپ نمائش ہے تو
تو ہی ہے بے ابر فضا میں
صحراؤں میں بارش ہے تو
تنہائی میں تیری یادیں
گردش میں آسائش ہے تو

(4)

نئے موسم میں ڈھل کر دیکھنا تھا
ہمیں خود کو بدل کر دیکھنا تھا
بلا کی خوبصورت ہے یہ دنیا
اسے گھر سے نکل کر دیکھنا تھا
بہت ممکن تھا رستے راس آتے
ہمیں کچھ دور چل کر دیکھنا تھا
ہم اپنے آپ سے اکتا گئے ہیں
ہمیں خود سے نکل کر دیکھنا تھا
ان آنکھوں کو غلط لت لگ گئی ہے
حسیں منظر سنبھل کر دیکھنا تھا
بتوں پر تبصرہ کرنے سے پہلے
تمہیں پتھر میں ڈھل کر دیکھنا تھا

☆☆☆

Yaqoob Tasawwur (USA)
یعقوب تصور (امریکہ) cell-001-636-293-0421

چشم خوابیدہ ،کبھی چشم کشادہ سوئے
تشنہ سوئے ،کبھی پیتے ہوئے بادہ سوئے
شاہ ہے نیند کی آغوش میں محو راحت
اور یہ حکم ہے کوئی بھی نہ پیادہ سوئے
عرصہءزیست میں ہے قوم بھی حسبِ تعریر
کم کوئی سوئے یہاں ،کوئی زیادہ سوئے
ہاتھ پاؤں میں لپٹ کر ہی کوئی لیٹ رہے
اور اوڑھے کوئی ریشم کا لبادہ سوئے
خوابِ تحصیل منازل کا نہ تعبیر ہو گر
عزم پر گاہ جگائے ،پہ ارادہ سوئے
یہ خبر ہے کسے جاگے کے نہ جاگے وہ جو
کل ملاقات کا کرتے ہوئے وعدہ سوئے
عرش چادر ہو تصور تو رہے فرش زمیں
ہم کو جس جا کبھی سونا ہوا، سادہ سوئے

☆☆☆

(2)

زمین میرے لئے ہے یہ آسمان مرا
تو لامکاں بھی ہے میرے لئے مکان مرا
ہجوم ظلم و مصائب میں بھی سلامت ہوں
سبب یہ ہے کہ ہے اللہ نگہبان مرا
یہ بات روز ازل سے ہے مستند برحق
میں اس کا بندہء خاطی وہ مہربان مرا
طلسم حسن سے یوں قلب و ذہن ہیں مسحور
کہ ایک لمحہ بھی ہٹتا نہیں ہے دھیان مرا
نصیب عمر مسافت ہے بحر ملزم کی!
ہوا نے کھول کے رکھا ہے بادبان مرا
کوئی بھی اس کو کم و بیش کر نہیں سکتا
مرے نصیب میں جتنا بھی ہے زیان مرا
یہ کامرانیء ہر ہر قدم خدا ہی سے ہے
یقین واثق و محکم ہوا گمان مرا
نظام کوفہ کے با وصف تھا یقیں نہ مجھے
کرے گا قتل مجھے خود ہی مہربان مرا
عطا خدا کی تصور ہے ایک اک مصرعہ
میں کیسے دعویٰ کروں ہے کوئی دِوان مرا

☆☆☆

ب

Afsane افسانے

Woh Ghar Kaisa hoga by Vehshi Syed (Srinagar)cell-9419012800
وحشی سعید (سرینگر)

وہ گھر کیسا ہوگا

وہ دوسرا آسمان کھوجنے نکلا۔ ماضی اب اُس کے لئے قصۂ پارینہ بن گیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ وہ کیا تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ وہ وقت کیسا رہا ہوگا جب اُس کے خوابوں میں ماضی بستا تھا۔ اُس زمانے میں شہر خاص کے بیچوں بیچ نالہ مار رواں دواں تھا۔ نالہ مار کے کناروں پر شہر خاص کی بیشتر آبادی سکونت پذیر ہوا کرتی تھی۔ نالہ مار نہ صرف شہر خاص کی وحدت کی علامت تھا بلکہ تاریخ کشمیر کے سنہرے دور کا راوی بھی تھا۔ نالہ مار پر بنا نائید کدل اُس زمانے میں ایک ایسا پل تھا جو شہر خاص کو شہر جدید کے ساتھ جوڑتا تھا۔ اسی نالہ مار پر ایک قدیم مسجد ''اند مسجد'' کے نام سے مشہور تھی۔ اند مسجد یعنی آخری مسجد۔ یہ مسجد محلہ ''اندرووُر'' میں واقع تھی۔ اندر ووُر یعنی اندرونی محلہ۔ اسی محلہ میں ایک ایسا کنبہ رہتا تھا جو کسی زمانے میں شہر خاص کے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن اب اُس خاندان کے بیس بائیس افراد ایک بوسیدہ مکان میں کسمپرسی کے عالم میں گزر بسر کر رہے تھے۔

اس خاندان میں ایک ایسے نونہال نے جنم لیا تھا جس کو اسکول جانے سے چڑ تھی۔ وہ ہمیشہ اسکول سے بھاگ جاتا تھا۔ اپنے اساتذہ سے لڑائی جھگڑا کرتا تھا۔ اُس کا باپ اُس سے بہت نالاں

تھا۔ آخر کار اُس نے اس بچے کو اسکول سے اُٹھا کے ایک کارخانے میں ڈال دیا، تا کہ وہاں کچھ کام سیکھے۔ اس کارخانے میں تانبے کے برتن بنتے تھے اور یہ کارخانہ بچے کے ننہال والوں کا تھا۔ یہ لڑکا اس نئے کام میں دلچسپی لینے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے برتنوں کی نقش نگاری میں اتنا ماہر ہو گیا کہ لوگ اس کی فنکاری کو دیکھ کر حیرت میں پڑ جاتے تھے۔

لڑکا جب چودہ سال کا ہوا تو ایک دن امیرا کدل کے بس اڈے کے سامنے کھڑا ہو گیا، جہاں سے بسیں راولپنڈی روانہ ہوا کرتی تھیں۔ بس کنڈیکٹر اونچی اور بے ترتیب آواز سے سب کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا ۔ ۔ ۔

''پنڈی ۔ ۔ پنڈی ۔ ۔ پنڈی ۔ ۔ !''

اس چودہ سال کے لڑکے نے جب اپنے بڑے بھائی کو اس بس میں سوار ہوتے ہوئے دیکھا تو وہ زار و قطار رونے لگا۔ اپنے بڑے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا ۔ ۔ ۔

''مجھے بھی پنڈی لے چلو ۔ ۔ !''

بڑے بھائی نے پوچھا ۔ ۔ ۔

''وہاں کیا کرو گے ۔ ۔ ۔ ؟''

چھوٹے نے کہا ۔ ۔

''تمہارا کھانا پکا لوں گا''

گھر والے تو بڑے بھائی کو رُخصت کرنے آئے تھے لیکن اُس نے چھوٹے بھائی کی معصومیت دیکھ کر اُن سے کہا :

''چھوٹا میرے ساتھ آئے گا''

تانبے پر نقش و نگار کرنے والا وہ لڑکا ایک نئے سفر پر روانہ ہوا۔ امیرا کدل کے بس اڈے سے پنڈی روانہ ہونے والی بس میں وہ خود سونے کے قلم سے اپنی قسمت لکھنے کے لئے نکل پڑا۔ اس نئے سفر میں اُس کی زندگی میں ایسے کتنے مرحلے آئے ہوں گے جہاں اُس کے پاؤں ڈگمگائے ہوں گے۔ لیکن وہ ثابت قدم رہا اور ہمیشہ خود سے کہتا رہا ۔ ۔ ۔

''مجھے غربت کی دلدل سے نکلنا ہے۔ مجھے اپنے آپ کو افلاس کی زنجیروں سے آزاد کرنا ہے۔ اپنے لئے ایک نئی دنیا سجانی اور سنوارنی ہے۔ ایک ایسی دنیا جس کو دیکھ کر سب یک زبان ہو کر کہیں ۔ ۔

''کیا ایسا بھی ہوتا ہے ۔ ۔ ؟''

وقت ہوا کے ساتھ تحلیل ہوتا گیا اور پھر ایسا ہی ہوا ۔ چالیس سال کی عمر میں وہ اپنے شہر کی مشہور و معروف شخصیتوں میں شمار ہونے لگا۔ جو بچہ الف سے آگے نہیں پڑھ سکا تھا، آج اُس کے پاس درجنوں تعلیم یافتہ افراد کام کر رہے تھے۔ اُس نے اپنی دنیا اب ایسی بنائی تھی کہ دیکھنے والے رشک کر رہے تھے۔ اللہ نے اُسے چار بیٹیوں اور ایک بیٹے سے بھی نوازا تھا۔ پھر ایک دن ایسا بھی آ گیا جب وہ شہر خاص سے شہر جدید میں منتقل ہو گیا۔ شنکر آچاریہ پہاڑی کے دامن میں اُس نے ایک ایسی حویلی بنائی جس کے اردگرد میٹھے پانی کے آبشار اتنا اُونچا اُچھلتے تھے کہ یوں لگتا تھا کہ آنکھ جھپک کر وہ آسمان اپنے اندر جذب کر لیں گے۔ رات کو یہ حویلی ایک شاہکار میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ یہ حویلی چاند رات کی چاندنی میں اپنے حسین ہونے پر اتنا اتراتی تھی جیسے کسی کنواری لڑکی کو پہلی بار اپنی خوبصورتی کا احساس ہوتا ہے۔ لوگ آپس میں کہتے تھے ۔ ۔

''اس شخص کی کامیابی کو دیکھ کر لگتا ہے کہ سچ مچ خواب حقیقت میں بدلتے ہیں''

اُس کی ترقی نے ہوا جیسی رفتار پکڑی تھی۔ وہ اپنے پیچھے ایک ایسی روایت چھوڑنا چاہتا تھا جو تاریخ میں ایک نایاب باب بنے۔

اب ایک دن ایسا بھی آ گیا جب اُس نے اپنی بڑی بیٹی کی شادی انجام دی۔ سارے شہر کو دُلہن کی طرح سجایا گیا۔ یوں لگتا تھا کہ سارا شہر رنگوں میں ڈوب گیا ہو۔ باراتیوں میں شہر کے سرکردہ دانشوروں، رئیسوں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ شادی خانہ آبادی کا ایسا جشن دوبارہ نہیں دیکھا گیا۔ بس حاتم طائی کا سوال ۔ ۔

''ایک بار دیکھا ہے، پھر دیکھنے کی تمنا ہے''

اب اس کا بیٹا بائیس سال کا ہوا تھا۔ جدید تعلیم سے آراستہ ہو کر وہ بھی اپنے والد کے کاروبار میں شامل ہو گیا۔ ساٹھ سال کی عمر میں اُس نے اپنے بائیس سال کے بیٹے کو کاروبار کے گُر سکھائے ۔ بہت جلد اُس کا بیٹا کاروباری دنیا میں ایک جانی پہچانی شخصیت بن گیا۔ اپنی بیٹیوں کی شادی کے فرائض انجام دینے کے بعد وہ اپنے بیٹے کی شادی میں جٹ گیا۔ شہر کے معزز اور معروف گھروں سے رشتے آنے لگے۔ بالآخر ایک نہایت عزت دار اور معزز گھرانے میں رشتہ طے پایا۔ بہت دنوں بعد شہر نے شادی کی ایک ایسی تقریب دیکھی جہاں باراتیوں کے آگے آگے دُولہے کو گھوڑے پر سوار دیکھا گیا۔ نغموں، پٹاخوں اور پھولوں کی بارش میں دُولہے کا استقبال کیا گیا۔ جب دیر رات گئے دُلہن کی رخصتی ہوئی تو دُولہے کی شاندار حویلی میں دُلہن کا استقبال کیا گیا۔

وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔اب اس کا بیٹا کاروبار کو وُسعت دینے میں مصروف ہوگیا۔وہ اپنی گھریلو زندگی سے مطمئن تھا۔خوبصورت شریک حیات پا کر اُسے اپنی زندگی بھی خوبصورت دکھائی دینے لگی۔خدا نے اپنی مہربانی سے اُسے اولاد کی صورت دونوں پھل عطا کئے یعنی اُسے دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا۔ستر سال کا یہ بوڑھا اپنے ماضی کو نظر ڈال کر خود کو ایک کامیاب انسان کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔اُس نے گاف کے کھیل کو اپنے لئے تفریح کے سامان کے طور پر چنا تھا۔وہ گاف کے میدان میں جب گاف کی اسٹک لے کے چلتا تھا تو اپنے دوستوں سے اکثر ذکر کرتا تھا ۔ ۔ ۔

''میں زندگی سے بہت خوش ہوں۔زندگی نے مجھے بہت کچھ دیا''

دوست کہتے تھے ۔ ''اللہ آپ پر مہربان ہے'' وہ اُن سے کہتا ۔ ۔ ۔

''اللہ اُن پر مہربان ہوتا ہے جو محنت کو اپنا مقصد بناتے ہیں''

اب اُس کے پاس کیا نہیں تھا جو مانگا تھا وہ بھی ملا اور جو نہیں مانگا تھا وہ بن مانگے ملا۔اُس کا بیٹا اپنے والدین کے لئے ایک مثالی بیٹا بن گیا۔جہاں جہاں اُس کے والدین جاتے وہ اُن کے لئے پلکیں بچھاتا تھا۔اپنے والدین کے ہر حکم کو اپنے لئے فرمان الٰہی سمجھتا تھا۔حالانکہ اب وہ خود بھی ساٹھ سال کا ہوگیا تھا۔نوے سال کے دادا اور ساٹھ سال کے والد کے سامنے بچوں نے ایک انوکھی فرمائش رکھی ۔

''پاپا یہ حویلی بہت چھوٹی ہے''

نوے سال کے دادا نے اپنے ساٹھ سالہ فرزند سے کہا ۔ ۔ ۔

''بیٹا اب تمہاری ذمہ داری بنتی ہے کہ تم میرے پوتوں کی فرمائش پوری کرو''

دادی نے کہا ۔ ۔ ۔''اس حویلی میں کیا خرابی ہے ۔اس حویلی میں تم دونوں اس دنیا میں آ گئے''

دونوں پوتے ایک ساتھ اپنی دادی سے مخاطب ہوئے ۔ ۔ ۔

''یہ حویلی اب Old Fashion کی ہے۔ہمیں بڑی اور ماڈرن حویلی چاہیے''

بچوں کی ماں نے دھیمی آواز میں کہا ۔ ۔

''آسمان تو نہیں مانگا، ایک بڑا گھر ہی تو مانگا ہے''

ساٹھ سال کا والد اپنے بچوں کی خواہش پوری کرنے میں لگ گیا۔سیاحت کی کتابوں میں جہاں کشمیر کا ذکر آیا ہے وہاں مغل باغات پر بھی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ان باغات میں شالیمار سرفہرست ہے۔ اسی شالیمار باغ کے پہلو میں زمین کے ایک خوبصورت خطے سے دل کو چھو لینے والی ڈل جھیل پر جب نظر پڑتی، تو دل کو سکون میسر ہوتا ہے۔زمین کے اس خوبصورت خطے پر دادا پوتوں کے لئے، اُس کے

ساٹھ سال کے بیٹے نے، بیٹوں کی فرمائش پر ایک خوبصورت محل تیار کیا۔

دو سال کی محنت اور کثیر دولت خرچ کرنے کے بعد انسانی سوچوں نے زمین کے خطے پر ایک ایسا محل کھڑا کیا، کہ اُس محل سے گزرنے والے کچھ دیر کے لئے رُک کر اُس حویلی کو دیکھتے تھے اور سب یک زبان ہو کر یہ کہتے تھے ۔ ۔ اللہ اللہ فن کا ایسا نمونہ نہ کبھی پہلے دیکھا ہے اور نہ سنا ہے۔ ایسے محل صرف طلسمی داستانوں کا حصہ ہوتے ہیں۔

بیانوے سال کا بوڑھا، باسٹھ سال کے بیٹے کے ساتھ اپنے تمام اہل وعیال کے ہمراہ اپنے اس بے مثال محل میں منتقل ہو گیا۔ یہ پل اُن کے لئے زندگی کا سب سے انمول پل تھا۔ اُس حویلی کی دیواروں کو چھوتے ہوئے دادا اپنے یقین کو یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ میرے بیٹے نے ایسا انوکھا اور بے مثال کارنامہ انجام دیا۔ جب محل میں اُن کو کچھ مہینے رہتے ہوئے گزرے تھے، تب دادا سے اپنے پوتوں نے کہا ۔ ۔ ''پاپا بیمار ہیں'' دادی نحیف ہونے کے باجود کھڑی ہو گئی۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا''

اُس کے باسٹھ سال کے بیٹے کو بیماری نے چند دنوں میں ایسا جکڑا کہ بیماری جانے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ اب اُن سب کو یہ کیوں لگنے لگا، یہ بیماری جانے والی نہیں ہے۔ ماں نے جب اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے چراغ کو بجھتے ہوئے دیکھا، وہ بار بار اللہ سے کہتی ۔ ۔ ''اللہ! میرے ساتھ یہ کیا ظلم ہو رہا ہے۔ میں اپنے بیٹے کو اپنے سامنے کیسے جاتے ہوئے دیکھ سکتی ہوں''

آسمان ابر آلود تھا۔ تھوڑی دیر بعد مطلع صاف ہو گیا۔ سورج کی پہلی کرن اُس کی ماں کو چھو گئی۔ یہ کرن اُس کی ماں کو حیات جاوداں بخش گئی۔ پھولوں سے خوشبو نکل کر فضاؤں میں پھیل گئی۔

وہ کمزور تھا بے حد کمزور تھا ۔ ۔ پھر بھی اپنی ماں کے جنازے میں شامل ہو گیا۔ وہ اپنی ماں سے کہتا رہا ۔ ''ماں کچھ دنوں کی بات ہے، میں بھی آ رہا ہوں''

باپ نے اپنی اہلیہ کا جب تابوت روانہ ہوتے دیکھا۔ تو کہنے لگا ۔ ''تم خوش قسمت ہو''

اپنی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ بہایا۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا کہ بیانوے سال کے بوڑھے کے لئے وقت تھم گیا جب اُس نے اپنے بیٹے کی میت کو تابوت میں رکھتے ہوئے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڑ آیا۔ پس منظر میں شہر کی سب سے بڑی حویلی خاموشی سے اپنے خالق کی میت کو دیکھ رہی تھی۔ وہ آنسو بھی نہیں بہا سکتی تھی۔ بیانوے سال کا وہ بوڑھا ہر ایک سے پوچھ رہا تھا، میرا بیٹا جہاں جا رہا ہے، وہ گھر کیسا ہو گا ۔ ۔ ۔ ؟

☆☆☆

Meri Kahani ka Sach by Noor Shah (Srinagar) cell-9906771363
نورشاہ (سرینگر)

میری کہانی کا سچ

ہر کہانی کا اپنا ایک سچ ہوتا ہے!
اور میں اُس سچ کی تلاش میں بہت دور نکل آیا ہوں!!
کیا میرا سچ مجھے مل جائے گا؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں اُبھر کر میری سوچوں کو روشن کرتا ہے اور مجھے اُس کہانی کی یاد دلاتا ہے جس کے لفظ وحرف میں وہ سچ پوشیدہ ہے آج جب میں اُس سچ کا اعتراف کر رہا ہوں۔ زندگی کے سٹیج پر نمودار ہو کر اپنی عمر رفتہ کو ایک سٹیج آرٹسٹ کے روپ میں آواز دے رہا ہوں۔ میرے اس کردار میں کوئی نیا پن نہیں، کوئی جاز بیت نہیں اور کوئی نئی کہانی بھی نہیں۔ ویسے میں اپنی زندگی کے نہ جانے کتنے ماہ وسال دیکھ چکا ہوں، کتنے پڑاؤ طے کر چکا ہوں لیکن کیا کروں ماضی کی یادیں اب بھی سانسوں میں رچی بسی ہیں اور خوشبو بن کر جھوم رہی ہیں۔ میری زندگی کے سٹیج پر کئی اور چہرے نظر آرہے ہیں، کچھ زنانہ کچھ مردانہ۔ یوں تو ہر سٹیج آرٹسٹ کو اپنا رول خوبصورت نظر آتا ہے، سندر سندر سا اپنے رنگ ولباس میں اپنے بانکپن اور عزم میں لیکن اب ان سے بہت سارے کلاکار، بہت سارے سٹیج آرٹسٹ میری ہی طرح اپنی زندگی کے سٹیج پر اپنا کھیل کھیل چکے ہیں، اپنا اپنا کردار نبھا چکے ہیں اس لئے ان کرداروں یا ان کلاکاروں سے میرا کیا تعلق؟ ان چہروں سے میرا کیا واسطہ..... کیسا رشتہ؟ میں تو کب کا سٹیج سے نیچے اُتر آیا ہوں۔ سب کچھ بول چکا ہوں لیکن اس کہانی کا کیا کروں جس میں سچ پوشیدہ ہے یہ کہانی، میری کہانی سٹیج سے ہی تعلق رکھتی ہے اور راج رانی کا کردار اس کہانی کا ایک حصہ ہوسکتا ہے.....اس کہانی کا ایک چہرہ.....؟!
اور اب میں بہت دور نکل جانے کے باوجود نزدیک آرہا ہوں، کہانی کے قریب، کہانی کے سچ کے قریب.....
جب راج رانی پہلی بار سٹیج پر اپنا کردار نبھانے کے لئے ہمارے ڈرامہ کلب میں شامل ہوئی تھی تو پہلی ہی نظر میں مجھے بے حد خوبصورت لگی تھی۔ گلاب کا پھول جیسی اور جب یہ پھول سٹیج پر اپنی مہک بکھیرنے لگا تو کلب کو اپنی ایک الگ شناخت ملنے لگی، پہچان ملنے لگی اور پھر آہستہ آہستہ یہ شناخت، یہ پہچان ایک نام میں بدل گئی اور یہ نام مقبولیت حاصل کر گیا۔ راج رانی ایک سچائی بن کر تھیٹر کی دنیا میں اُبھر چکی تھی۔ میں بھی سٹیج کا ایک کردار تھا، ایک آرٹسٹ، ایک کلاکار، ایک چہرہ اور سچائی کو اپنانا چاہتا تھا۔ راج رانی کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا تھا۔ میں شاید..... نہیں یہ ایک

حقیقت ہے کہ میں راج رانی سے پیار کرنے لگا تھا۔ راج رانی بھی میرے جذبات، احساسات اور خیالات سے بے خبر نہ تھی۔ وہ بھی مجھے چاہنے لگی تھی۔ بے خبری کے اس عالم میں ہم نے ایک نئے ڈرامے کی شروعات کی۔ مجھے خاوند کے کردار کے لئے منتخب کیا گیا اور راج رانی کو بیوی کا کردار نبھانے کی ذمہ داری دی گئی..... یہ ڈرامہ اس قدر کامیابی کی منزل سے ہمکنار ہوا کہ میری اور ارج رانی کی پہچان میاں بیوی کے روپ میں سامنے آنے لگی۔ حالانکہ اپنے تجربات اور مشاہدات کے پس منظر میں، میں نے کبھی بھی ڈرامہ میں لفظوں اور جملوں کی ادائیگی کو حقیقت بنتے نہیں دیکھا تھا لیکن ایک شب دیر تک جب ہم ڈرامہ کلب سے گھر کی جانب آرہے تھے تو نہ جانے کیا ہوا، کون سی حس جاگ پڑی۔ زندگی کا کون سا لمحہ خوبصورتی کا لباس اوڑھے سامنے آگیا..... وہ شب ہم نے ایک ساتھ گذار دی، ایک بن کر، ایک روپ اپنا کر..... یہاں بیوی بن کر اور یہ ڈرامہ کا کوئی منظر نہ تھا اور نہ ہی ہم ڈرامہ کے کردار تھے۔ یہ ایک حقیقت تھی!

اور یہ سلسلہ چلتا رہا خاموشی کے صحرا میں پھول کھلتے رہے، اُن کی خوشبو، اُن کی مہک پھیلتی رہی، بکھرتی رہی، نکھرتی رہی..... اور پھر اچانک ایک دن میرے کانوں سے راج رانی کی آواز ٹکرائی۔

''شنکر..... میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے'' ''ایسا ہو چکا ہے'' ''اور ہماری سٹیج کی دنیا..... اُس کا کیا ہوگا؟''

''حقیقی دنیا سے سٹیج کی دنیا سے کیا تعلق؟''

''راج رانی میں تم کو چاہتا ہوں، بے حد چاہتا ہوں لیکن ابھی سٹیج کی دنیا ہی میرے لئے اہم ہے، بہت اہم.....''

''میرے ہونے والے بچے کی کوئی اہمیت نہیں''۔

''بچہ پھر بھی آسکتا ہے۔ لیکن سٹیج..... ہمارا مستقبل، ہمارے آنے والے دن، امانت ہیں ہمارے پاس..... سٹیج کی امانت.....!'' ''اور میرے پاس تمہاری جو امانت ہے اُس کا کیا ہوتا''۔

''مجھے سوچنے کا موقع دو.....''

''لیکن میں سوچ چکی ہوں۔ تمہاری امانت میں کوئی خیانت نہ ہوگی..... میرا فیصلہ ہے''۔

اور جب میں سوچتے سوچتے تھک گیا اور کئی ماہ بعد سوچوں کے دلدل سے باہر آیا تو راج رانی کی تلاش شروع کر دی لیکن وہ شہر چھوڑ کر چلی گئی تھی، کب، کہاں اور کیسے؟ یہ معلوم نہ ہوسکا، کوئی بتا نہ سکا، قریب سے جاننے والے بھی بے خبر تھے، اُس نے سٹیج کی دنیا سے سنیاس لیا تھا شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لئے.....!!

وقت کا پہیہ گھومتا رہا، موسم بدلتے رہے لیکن میں راج رانی کو پا نہ سکا۔ ظاہری طور پر ہم ایک ہی تکون کے تین زاوئے تھے، سٹیج، راج رانی اور میں لیکن ایک دوسرے کے ہو کر بھی ملنے نہ پائے تھے۔ میں اپنی ہی کہانی کے اپنے سچ کو پا نہ

سکا، پہچان نہ سکا، تلاش نہ کر سکا.....؟

مدتوں بعد جانے سرکار نے یہ کیسے فیصلہ لیا کہ بزرگ قلم کاروں، صحافیوں، فنکاروں اور سماج کی ممتاز شخصیات کو انعام و اکرام سے نوزا جائے۔ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اُن کی صلاحیتوں کی قدر کی جائے۔ فہرست میں میرا نام بھی شامل تھا حالانکہ میں بہت پہلے سٹیج سے دور ہو چکا تھا اور صرف اپنی ہی کہانی میں سچ کی تلاش میں مصروف تھا.....

گذشتہ بائیس برسوں سے، زندگی کی تاریخ میں بائیس برس کوئی کم مدت نہیں ہوتی۔

اور اسی دوران مجھے یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ سرکار پہلی بار بزرگ فنکاروں کو، نئی نسل، نئی پود کے قلم کاروں اور فنکاروں کے ہاتھوں انعام واکرام سے نواز نے جارہی ہے تا کہ نئی نسل کو اپنی صلاحیتوں کا احساس ہو، اپنے مستقبل کو سنوانے سجانے کا جذبہ پیدا ہو اور سماج کی تئیں اپنی ذمہ داریوں سے آشنائی ہو۔ میں نے جب شہر کے کلچرل سنٹر میں اپنی کرسی سنبھالی اور دائیں بائیں دیکھا تو ہال میں کافی لوگ نظر آرہے تھے بہت سے ان جانے اور جانے پہچانے لوگ .....ان میں صرف راج رانی نہ تھی۔ سٹیج کے ایک جانب پرانے زمانے کے فنکار نظر آرہے تھے اور دوسری جانب نئے زمانے کے فنکار۔ نئی نسل پرانی نسل کی عزت افزائی کے لئے کافی شاد ماں دکھائی دے رہی تھی۔ جب میرا نام پکارا گیا اور میں سٹیج کے درمیاں اپنا انعام لینے کے لئے کھڑا ہو گیا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور اسی دوران ایک نوجوان فنکار میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

''کیسے ہیں آپ؟'' ''میں ٹھیک ہوں، شکریہ!''

میری شال پوشی کی لیکن میرے ہاتھوں میں مومینٹو دیتے وقت اس کی دھیمی دھیمی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''آپ کو قریب سے دیکھنے اور آپ سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ آج یہ تمنا پوری ہو رہی ہے، میری زندگی کی بڑی قیمتی اور اہم تمنا..... آج مجھے واقعی زندگی کی انمول خوشیاں مل رہی ہیں''۔

''بیٹا..... میں اس قابل نہیں''۔

''نہیں آپ نہیں جانتے کہ آپ کون ہیں اور کیا ہیں؟ میں نے اس شادمانی کے لئے بائیس برس انتظار کیا ہے؟''

''وہ کیوں..... تم..... تم کون ہو''۔

''میں.....''

''ہاں ہاں کہو..... تم کون ہو۔''

''میں راج رانی کا بیٹا ہوں''۔

میری کہانی کا سچ میرے سامنے تھا.....!!!

☆☆☆

Sabse tez,sabse Aage by Prof. Aslam Jamshedpuri (HOD Urdu CCS University Meerut) cell-8279907070, 9456259850

پروفیسر اسلم جمشید پوری (صدر، شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

سب سے تیز، سب سے آگے

''ہمارے ملک کے ایک معروف لیڈر نے، ہمارے دشمن ملک کے صدر سے ملاقات کے دوران، ان کے رہنمائے اعظم کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔ ان کے اس بیان پر پورے ملک میں غم و غصے کا اظہار کیا جا رہا ہے۔''

آپ کا چینل ''ٹی ون'' اس بار بھی سب سے پہلے آپ کو خبر دے رہا ہے۔

☆

''ایک پرائیویٹ لیب میں دھلنے آئی کیمرے کی فلم میں آتنک وادیوں کی تصاویر سے پورے ملک میں ہلچل۔۔'' تفصیل بس تھوڑی دیر میں۔۔ کہیں مت جائیے گا، ہم لوٹیں گے بریک کے بعد۔۔ ایک بار پھر اس خبر کو، دوسرے چینلز سے پہلے دے کر، ''ٹی ون'' نے خود کو نمبر ون ثابت کر دیا ہے۔

☆

لیجئے ہم آپ کے لئے پھر ایک سنسنی خیز خبر لے کر حاضر ہیں۔

''دہلی کے ایک معروف غیر سرکاری اسکول کے ایک طالبعلم نے اپنی ساتھی کے ساتھ نازیبا حرکت کی فلم بنا کر اسے سوشل میڈیا پر وائرل کر دیا۔''

یہ خبر بھی آپ کو سب سے پہلے ہمارا چینل دے رہا ہے۔ چینل ٹی ون کا وعدہ۔۔ خبر دے سب سے زیادہ۔۔ سب سے آگے اور سب سے تیز۔۔ لائے خبریں سنسنی خیز۔۔

☆

ایک ہنگامہ خیز خبر ملاحظہ کریں۔'' دہلی کے وزیرِ اعلیٰ اروند کیجری وال کو ای ڈی نے گرفتار کر لیا ہے۔ آپ اور وزیرِ اعلیٰ کے حامیوں میں غصے کی لہر۔ دیکھیے اس اقدام سے اروند کیجری وال کو فائدہ

ہوتا ہے یا حکمراں جماعت بی جے پی کو۔''

☆

ہم خبروں اور بحث ومباحثے میں بھی سب سے آگے رہے ہیں۔ہم نے ہمیشہ نئے اور تازہ ترین واقعات پر گرما گرم بحث کی ہے۔ ہمارے پینالسٹ میں مذہبی رہنما، سیاسی لیڈران سے لے کر سماجی زندگی کے اہم اشخاص ہوتے ہیں۔ ہمارے اینکرز کے سامنے اچھے اچھوں کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔کیوں کہ وہ تحقیق کر کے موضوع سے متعلق بہتر مواد، اچھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔کبھی کبھی انہیں چیخنا اور چلّانا بھی پڑتا ہے۔ یہ سب آپ کے بل بوتے ہی ہوتا ہے۔

''اس بار ہمارے اسٹوڈیو میں سوامی پہلاد پتی ، بھارتیہ سماج دل کے یوا نیتا چودھری یشونت، اسلامی مفکر مولانا تحسین فلاحی، بھارتیہ آزاد پارٹی کے منجھے ہوئے لیڈر لکشمن شرما موجود ہیں۔اور ہمیشہ کی طرح آج کا موضوع ''تین طلاق اور مسلم خواتین'' ہے۔''ٹی ون'' سب سے تیز ،سب سے آگے۔

☆

ہم ہر قیمت پر آپ کے لئے ایسی خبریں لاتے ہیں، جو آپ کو کہیں اور نہیں ملے گی۔ ہمارے رپورٹر جان کی پرواہ کئے بغیر خبریں لاتے ہیں۔اس بار بھی ایک ایسی ہی خبریں لے کر ہم حاضر ہیں۔دل تھام کے بیٹھئے۔''ایودھیا میں ٹرسٹ کے پیسوں کو لے کر رار۔مہنت گری داس نے اس کی سخت مخالفت کی ہے اور اس کی جانچ سی بی آئی کے ذریعہ کئے جانے کی مانگ کی ہے۔۔۔''

''رام مندر کا افتتاح ۔۔۔صدر جمہوریہ کے بجائے ہمارے پی ایم کریں گے ۔۔صدر جمہوریہ کا تعلق پسماندہ طبقے سے ہے۔''

☆

آزادی کے ۷۵ ویں جشن کے موقع پر''ہر گھر ترنگا'' مہم زوروں پر ہے۔اربوں اور کھربوں جھنڈے فروخت ہو رہے ہیں۔ ہر طرف ترنگا ہی نظر آرہا ہے۔

ہندوستانیوں میں جشن آزادی کو لے کر ایک بے مثال جوش وخروش نظر آرہا ہے۔

''ابھی ابھی خبر آرہی ہے کہ ہندوستان نے جھنڈے کی سپلائی کے لئے چین کو آرڈر دیا ہے۔۔۔یہ سب کیا ہے؟

ملک کے ایک یوا نیتا نے پردھان منتری سے سوال کیا ہے۔''

☆

چینل کے آفس میں ایک ضروری میٹنگ تھی۔''سر میں نے آپ کی باتوں کا خاص خیال رکھا تھا۔آپ نے کہا تھا کہ ہمارا چینل ایک ساتھ چھا جانا چاہئے۔ہمیں سب سے آگے رہنا ہے۔نمبر ون۔۔ٹی ون ازنمبرون۔۔۔اس کے لئے ہمیں کچھ بھی کرنا پڑے۔۔ہمیں سنسنی خیز اور دھماکے دار خبریں چاہئیں۔۔اورسب سے پہلے چاہئیں۔۔''

چینل کے ایک ذمہ دار نے سی یم ڈی سے کہا۔دراصل میٹنگ میں چینل کے سبھی ذمے داران،رپورٹرس،ایڈیٹر،بیروچیف،منصوبہ بنانے والے،مشیران وغیرہ موجود تھے۔

''ہاں!۔۔آپ کا بے حد شکریہ۔۔ہم سب مل کر محنت کررہے ہیں۔ہم نے چینل لانچ کرنے قبل ہی،ہر شعبے کے لئے ایک بڑی رقم طے کردی تھی۔لہٰذا آپ پیسے کی فکر نہ کریں۔۔''

''سراس سال ہماری ریٹنگ کیا ہے۔ہم ٹی آر پی کے لحاظ سے کہاں ہیں۔۔؟''

ایک رپورٹر نے سوال کیا تو اس کا جواب دینے کے لئے باس نے منصوبے والی ٹیم کے مینیجر کو کہا۔

''آپ اس کی فکر نہ کریں۔۔۔ہم ابھی تو تیسرے نمبر پر ہیں،لیکن ہم نے سب مینیج کرلیا ہے۔اس سال کے آخر تک ہم نمبرون بن جائیں گے۔۔۔''منصوبے کی ٹیم کے مینیجر نے جواب دیا۔

باس ایک بار پھر مخطب ہوا۔''آپ نے جو سنسنی خیز اور دھماکے دار خبریں ارسال کیں،وہ لائق تحسین ہیں۔ہمارے اینکر اور پریزنٹرز نے جس انداز سے خبریں پیش کیں۔۔وہ لاجواب ہے۔۔یہ ہم سب کا چینل ہے۔یہ آگے بڑھے گا تو ہم سب کا فائدہ ہوگا۔آپ سب کو تنخواہ کے علاوہ بونس،تین دن کا پہاڑی علاقے کا فیملی ٹرپ اور دوسرے انعامات بھی ملیں گے۔۔۔''

خوشی سب کے چہروں سے عیاں تھی۔سب نے اپنی فیملی اور دوستوں کے ساتھ مختلف پہاڑی علاقوں کے منصوبے بنانے شروع کردیے۔ایک رپورٹر بول اٹھا۔''وہ تو ٹھیک ہے سر! آپ کی مہربانی ہے۔پر خبریں پیدا کرنے اور مینیج کرنے میں جو پیسہ خرچ ہوا ہے۔اس کا پیمنٹ کب ہو گا۔۔؟''''ہاں۔۔ہاں۔۔وہ سب ہوجائے گا۔آپ اکاؤنٹ سیکشن کو ساری تفصیل لکھ کر بھیج دیں اور پیسہ لے لیں۔پیسے کی فکر نہ کریں۔۔اگر خبر نہیں بھی ہوتی ہے تو خبر پیدا کریں۔سنسنی پھیلائیں۔ضرورت پڑے تو دھماکے بھی کریں۔لیکن خیال رہے ان سب کے پیچھے سے آپ باہر نہ نکل آئیں۔آپ کا چینل''ٹی ون''نمبرون ہونا چاہئے۔ہمیں ہر قیمت پر آگے اور سب سے تیز رہنا ہے۔۔''

☆☆☆

Gadhe by Kachu Isfandyar Khan (Kargil, Laddakh) cell-6005889842
کاچو اسفندیار خان (کرگل، لداخ) 9419000933

گدھے

دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور اولادِ آدم اس کرۂ ارض پر کیا کیا گل کھلا رہے ہیں، یہ دیکھنے کی خاطر میں نے مدتوں بعد کل دیوار پر ٹنگا ہوا 'بیوقوفوں' کا صندوق کھولا۔ تو بی بی سی پر یہ خبر آ رہی تھی کہ اتھوپیا کی خانہ جنگی میں وہاں کے ٹیگاری علاقے سے ہزاروں مرد و زن اپنے ملک کی فوج اور خود ساختہ عسکریت پسندوں کی گولیوں سے اپنی نام نہاد زندگیوں کو بچانے کی ناکام کوششیں کرتے ہوئے اپنے ملک سے فرار ہو کر سوڈان کی سرحد کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر وحشت، نا اُمیدی اور بے بسی کے آثار نمایاں تھے۔ غور سے دیکھا تو اس جم غفیر اور بھاگم بھاگ کے درمیان سینکڑوں گدھے بھی ان نامراد رفیوجیوں کے شانہ بہ شانہ چل رہے تھے۔ اُن کے پیٹ پر ان قسمت کے ماروں کا اثاث البیت لدا ہوا تھا۔ جس میں عورتوں کے پھٹے پرانے دوپٹے، بچوں کی پھٹی ہوئی قمیص، ٹوٹے ہوئے برتن اور ادھ جلے ہوئے کمبل شامل تھے۔

میرے ذہن نارسا میں فوراً یہ خیال آیا کہ ان رفیوجیوں کے ساتھ باقی کوئی اور جانور کیوں نہیں جا رہا ہے۔ صرف گدھے ہی گدھے ہیں۔ غور و فکر کیا تو معلوم ہوا کہ بیچارہ گدھا تو ابتدائے آفرینش سے ہی انسانوں کا ملجا و غمخوار رہا ہے اور ہمیشہ انسانوں کے خود کردہ گناہوں کا بوجھ اسی قبلے کے سر پڑا ہے۔ لیکن ان گدھوں کی چال ڈھال اور رفیوجیوں کے ساتھ یک گونہ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ چلنے سے ایسا لگتا تھا کہ جب غریب ملکوں کے حکمراں امریکہ اور فرانس جیسے جنگی ہتھیار بنانے والے ملکوں کے پٹھو بن کر ان سے ہتھیار خرید کر اپنے ملکوں کے لوگوں پر استعمال کرتے ہیں تب اس کسمپرسی اور بے بسی کے حالات میں یہ گدھے ہی جانوروں کی طرف سے والنٹیر کے طور پر ان نیم مردہ رفیوجیوں کے دکھ درد کو بانٹنے کے لئے آگے آئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ جانوروں کے ہلال احمر کمیٹی کے ممبر ہیں۔ ریلیف اور باز آبادکاری کے کام میں انسانوں کی حتی المقدور مدد کر رہے ہیں۔

یہ خیال آتے ہی گدھوں کی فروتنی، جذبہ ایثار و قربانی اور ان کی درویشانہ صورت و سیرت کے

رموز مجھ پر کھلتے گئے۔ واقعی گدھوں کو جانوروں کا درویش اور ملنگ کہنا بے جا نہیں ہوگا۔ اگر ہم اپنے ذہن سے فرضی تصورات اور گدھوں کے بارے میں منفی سوچ کو ہٹا کر دیکھیں تو ان کی حلیمی، انکساری، مرنجا مرنج والی طبیعت اور ان کی چال ڈھال سے ان کے اندر چھپی ہوئی درویشی اور قلندرانہ سوچ دیکھنے والوں پر خود بخود منکشف ہوتی رہتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کی جسمانی ساخت بھی کچھ عجیب و غریب بنی ہوئی ہے۔ جب ابتدائے آفرینش کے وقت تمام جانوروں کو خلق کیا گیا تو اس وقت ہاتف تقدیر نے اعلان کیا تھا کہ تمام جانوروں کو ان کے جسم کے بعض مخصوص اعضاء میدان تخلیق سے الگ طور پر حاصل کرنے ہونگے۔ اس کے لئے ان اعضاء کے سینکڑوں ڈھیر لگے ہوئے تھے اور ہر ڈھیر کے اوپر ایک فرشتہ مقرر کیا گیا تھا۔ اعلان سنتے ہی گدھا سیدھے میدان تخلیق کی طرف روانہ ہوگیا کیونکہ حکم خداوندی کی تعمیل اس کی سرشت میں لکھی ہوئی تھی۔ ایک ڈھیر کے سامنے جا کر ادب سے کھڑا ہوگیا۔ اس ڈھیر پر تعینات فرشتے نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً ڈھیر سے دو چار اعضاء اٹھا کر گدھے کے جسم میں فِٹ کر دئے۔ کان اور ایک اور عضوء جو اونٹ کے لئے بنا تھا، غلطی سے گدھے کے جسم میں فٹ کر دیا۔ گدھے نے اس نعمت غیر مترقبہ پر سجدۂ شکر بجالایا اور چل دیا۔ کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے گدھے کو کان وغیرہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر ملے ہیں۔ لیکن کردار اور سیرت، خود منشائے الٰہی کے مطابق ملے ہیں۔ مثلاً صبر ان کے خمیر میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ آپ ان کو لاکھ گالی گلوچ دیں، چلائیں، گھنٹوں پا بہ کوبی کریں لیکن ان کو غصہ کبھی نہیں آتا ہے۔ یہ محض رضائے الٰہی کی خاطر اپنے من پر کنٹرول رکھتے ہیں۔ حلیمی و انکساری اس قدر کہ کوئی بچہ سوار ہو یا کوئی بوڑھا، اس میں تفاوت نہیں کرتے۔ بلکہ ایک ہی رفتار سے چلتے ہیں۔ آپ ان کے چوتڑ پر سوٹی برسائیں تب بھی ان کی قلندرانہ رفتار میں کوئی فرق نہیں آتا ہے۔ شاید اسی لئے محبوب کے چلنے کے انداز کو خراماں خراماں چلنے سے نسبت دی گئی ہے۔ یعنی 'خر' کی طرح چلنا، آہستہ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ چلنا۔ گدھوں کی طبیعت میں توکل بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کے نصیب میں روکھے سوکھے گھاس بوسے کے سوا کچھ نہیں لکھا ہے۔ لیکن کیا مجال کہ منہ سے اُف تک نکلے۔ سڑے سوکھے بھوسے کھا کر اپنے خدا کا شکر بجالاتے ہیں اور کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنے خیالوں کی دنیا میں کھو جاتے ہیں اور گھنٹوں اسی طرح مراقبہ میں محو رہتے ہیں۔ ہری گھاس ان کے نصیب میں لکھی ہی نہیں ہے۔ دروغ بر گردن راوی، کہتے ہیں کہ سوڈان وغیرہ ممالک میں بار برداری کے کام کے لئے صرف گدھے پالے جاتے ہیں۔ اول تو ان کی شرافت سے لوگ متاثر ہیں دوئم یہ کہ صحرائی علاقوں میں ہری گھاس ملتی ہی نہیں

ہے۔صرف خشک بھوسہ دستیاب ہوتا ہے۔ جسے گدھے بلا چوں و چرا کھا لیتے ہیں۔البتہ عمر بھر بھوسہ کھا کھا کر ان کی طبیعت کبھی کبھی اوب جاتی ہے۔اس لئے ان کے مالکوں نے ہر گدھے کے لئے سبز رنگ کی عینک بنوا رکھی ہے۔ایسی عینک پہنانے سے گدھوں کو خشک اور سفید بھوسہ بھی ہرا اور سبز نظر آتا ہے۔اس لئے اسے ہری گھاس سمجھ کر خوب کھا لیتے ہیں۔ یہ درویش صفت جانور ہزاروں سال سے انسانوں کے ساتھ رہنے کے باوجود ان کی چالاکی و مکاری سے نا آشنا رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ گدھوں کی سادہ لوحی اور شرافت کا انسانوں نے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔

گدھوں کی زندگی میں خوشیاں اور رنگا رنگی بہت کم ہوتی ہے۔ان کے نصیب میں انسانوں کی غلیظ گالیاں سننے اور بوجھ اٹھانے کے علاوہ کوئی اچھی چیز نہیں لکھی ہے۔ البتہ قانون فطرت کی تابعداری سے مجبور ہو کر کبھی کبھی ان کے جسموں میں سرمستی و سرخوشی کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔تب ان کی خرمستیاں دیکھنے کے لائق ہوتی ہیں۔جب خرمستیوں کا غلبہ ان پر دھاوا بول دیتا ہے تو وہ اپنے سر کو اوپر اُٹھا لیتے ہیں اور اپنی گردن کو ایک طرف موڑ کر اپنی آواز کے صور اسرافیل کو پھونکتے ہیں تو سارا ماحول لرز اُٹھتا ہے اور دور دور تک گھاس چرتی ہوئی گدھیاں بھی اپنی اپنی سریلی آوازوں میں ملن کے گیت گانے لگتی ہیں۔اُن کی آواز میں غضب کی گونج ہے۔اس گرج دار آواز کو سن کر تھوڑی دیر کے لئے شیر کے بدن میں بھی جھرجھری اُٹھتی ہے اور اس کا گردہ سکڑ جاتا ہے۔اور وہ اس آواز سے دور رہنے میں ہی اپنی آفیت سمجھتا ہے۔گدھے کی آواز تین کلومیٹر دور تک سنائی دیتی ہے۔

اگرچہ انسانی سماج میں لفظ گدھے کو ایک غیر تعریفی لفظ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔در اصل گدھے بہت ضدی ہوتے ہیں نہ کہ بیوقوف۔ان کے من میں جو بات بیٹھ جاتی ہے تو لاکھ جتن کرنے کے باوجود ان کو منوا نہیں سکتے ہیں۔اس بات کو لے کر لوگ لفظ گدھے کو بے وقوف، جاہل اور گنوار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔حالانکہ گدھے مستقل مزاج اور قول و فعل کے دھنی ہوتے ہیں۔ اپنے کام کو مستقل مزاجی کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں اور کبھی بھی ان کے پائے استقلال متزلزل نہیں ہوتا لہذا میں تو سمجھتا ہوں کہ گدھا کہنا کوئی گالی یا معیوب بات نہیں ہے بلکہ قوت ارادی کے پکے اور استقلال والے شخص کو گدھے سے تشبیہہ دینا بہت مناسب ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ گدھوں کی حلیمی اور شرافت اور مستقل مزاجی کے قائل پیغمبر بھی تھے۔ اسی لئے قرآن میں اسے حمیر کہہ کر پکارا گیا ہے۔یعنی بوجھ اُٹھانے والا۔گھوڑا سواری کے کام آتا ہے۔گائے دودھ دیتی ہے۔ یاک کھیت جوتنے کے کام آتا ہے۔ کتا رکھوالی اور محافظ کا کام کرتا ہے۔لیکن گدھے صرف بوجھ ڈھوتے

ہیں۔ کیونکہ یہ سب سے شریف النفس جانور ہونے کے ناطے، بچے اور عورتیں بھی اس کو آسانی سے ہانک سکتے ہیں۔ بے آب و گیاہ میدانوں میں روکھی سوکھی گھاس کھا کر گذارہ کر لیتا ہے۔ اور اپنے مالک کے لئے پریشانی کا باعث نہیں بنتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے حضرت عیسیٰ پیغمبر نے گدھے پر سوار ہو کر کئی بار فریضہ حج ادا کیا تھا۔ تا کہ اپنی سواری کی بود و باش کی فکر سے پرے ہو کر عبادت الٰہی میں کئی دن تک مستغرق رہ سکیں۔ حضرت کے ساتھ گدھے نے بھی بار بار خانہ خدا کا طواف کیا۔ لیکن کیا مجال کہ اس سعادت کی بنا پر وہ اپنی شرافت اور حلیمی کے جامے میں کوئی جھول آنے دے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ

خر عیسیٰ بہ مکہ سہ مرتبہ رسید وچوں باز آید خر بود

یعنی حضرت عیسیٰ کا گدھا تین بار مکہ پہنچا لیکن جب واپس آیا تو گدھا ہی تھا۔

اگر انسان ہوتا تو ایک بار حج کرنے کے بعد اس کا دماغ ہفت اقلیم پر پہنچا ہوتا۔

قدیم ایران کی نقاشی میں پیغمبروں، بزرگ پیروں، فقیروں اور دانشوروں کو گدھے کی سواری کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زہد و تقویٰ، مرشدی و پیرگی، علم و دانش اور پیغمبری و آگہی سے گدھوں کو بہت لگاؤ ہے۔ زہد و تقویٰ اور گدھوں کی طبعی میلان کے درمیان صرف ایک مہین سا پردہ حائل ہے۔ اس سے گدھوں کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ گدھے ہر کسی کے ملجا و ماوا اور غمگسار رہے ہیں۔ وہ اپنی شرافت اور متانت کی وجہ سے عورتوں اور بچوں میں بھی بے حد ہر دل عزیز رہے ہیں۔

یہ بھی اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ باقی تمام جانور اپنی فربہ جسمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس دھرتی کے سینے پر دندناتے ہوئے پھرتے ہیں اور کمزوروں کو اپنے پاؤں تلے روند کر چلتے ہیں۔ صرف گدھے ہی ایسی مخلوق ہے کہ وہ ہر وقت اپنے خالق کی یاد میں مشغول اور اس کی ذکر و تسبیح میں مستغرق نظر آتے ہیں۔

خطہ لداخ کے اس کرۂ زمہریر پر بھی قدیم زمانے سے گدھے پالنے کا رواج موجود تھا۔ یہاں گدھوں سے بار برداری کا کام لیتے ہیں۔ بیوپاری اپنے سودا سلف کے سامان کو گدھوں پر لاد کر تبت تک کا سفر کرتے تھے۔ اس سفر میں کئی کئی مہینے لگتے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں گدھوں سے بکری کے باڑوں سے کھاد لاد کر کھیتوں تک لے جانے کا کام بھی لیتے ہیں۔ اور یہ کام ایک عورت آسانی سے انجام دے سکتی ہے۔

وادی کشمیر میں بھی گدھوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ ماضی بعید میں سری نگر شہر کے لالچوک اور گردونواح میں کافی آوارہ گدھے خراماں خراماں گھومتے نظر آتے تھے۔ستر کی دہائی میں جب ہم لوگ ایس۔ پی۔کالج میں زیر تعلیم تھے۔تو ہوسٹل میں قیام رکھتے تھے۔ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم براڈوے سینما میں رات کے بارہ بجے کا شو دیکھ کر ہوسٹل کی طرف واپس لوٹتے وقت ان آوارہ گدھوں پر سوار ہوکر آتے تھے۔اس وقت کشمیر میں امن وامان کا یہ عالم تھا کہ ہم گدھوں پر سوار ہوکر گلا پھاڑ پھاڑ کر فلمی گانا گاتے ہوئے آتے تھے اور کہیں بھی کوئی تعرض کرنے والا نہیں ہوتا تھا۔ یہ بے مالک گدھے سیاحوں کی طرح خرمستیاں کرتے ہوئے پوری وادی کشمیر کے خوب صورت مناظر کا لطف اُٹھاتے تھے اور ہری ہری گھاس کھا کر لحیم شحیم بن جاتے تھے۔جب نوے کی دہائی میں ہند پاک کے رشتے میں کافی جھول آ گیا تو سرحدی علاقوں کے لوگوں کو پہاڑوں کی چوٹیوں پر فوج کا ساز سامان ڈھونا پڑتا تھا۔اس نازک وقت میں مقامی گدھوں نے ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ یہ گدھے بوجھ اُٹھا کر ان پہاڑوں پر چڑھ سکتے تھے۔دروغ بر گردن راوی، اسی دوران جب گدھوں کی ڈیمانڈ خوب بڑھی تو کچھ مقامی منچلے نوجوانوں نے سری نگر کے ان آوارہ گدھوں کو ٹرکوں میں لے جا کر سرحدی لوگوں کو بیچ دیا اور کافی پیسہ کمایا۔اس طرح یہ مست ملنگ جانور شہر سری نگر کے بازاروں سے غائب ہوگیا۔اور اب یہ بات ایک قصہ پارینہ ہوکر رہ گئی ہے۔

علم حیوانات کے ماہر کہتے ہیں کہ انسانوں نے تقریباً پانچ چھ ہزار سال قبل گدھوں کو پالنا شروع کیا تھا۔تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی معاشی زندگی کے ارتقاء میں گدھوں کا اہم رول رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ آج کے ماڈرن اور ٹکنالوجی کے دور میں بھی تقریباً چالیس ملین گدھے غریب اور ترقی پذیر ملکوں میں بطورُ پیک انیمل استعمال ہوتے ہیں اس سے یہ بات مسلم بن جاتی ہے کہ ان گدھوں کی اہمیت کبھی بھی کم نہیں ہوگی۔

☆☆☆

Iqbal ki Falsafana Shairi ka Mazhab aur Samaj par Asar by Mohd. Javaid

(Research Scholar Dept. of Persian JNU, New Delhi)

محمد جاوید (ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

اقبال کی فلسفانہ شاعری کا مذہب اور سماج پر اثر

چکیدہ:۔ انسان جب عقل وشعور کی منزل میں داخل ہوتا ہے، تو اس کے ذہن ودماغ میں خود اپنے وجود سے متعلق اپنے آس پاس رہنے والوں کے متعلق اور اس کائنات میں موجود اشیاء کے متعلق جس کا ایک ادنی سا حصہ ہے مختلف طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ انسان اپنی فطرت کے تقاضے کے تحت اس طرح کے سوالات کے حل ڈھونڈنے کی کوشش بھی اپنی عقل وشعور کی روشنی میں کرتا ہے، ان سوالات میں سے کچھ ایسے ہیں، جنہیں وہ منضبط علم کی مدد سے حل کر لیتا ہے، جبکہ کچھ سوالات ایسے ہوتے ہیں، جن کا حل پیش کرنے سے وہ قاصر رہتا ہے۔ انسان کے ذہن میں پیدا ہونے والے جن مسائل کو حل کرنے سے عاجز رہتا ہے، تو اس طرح کے مسائل کو حل کرنے کی مزید کوشش کی جاتی ہے، اسی کوشش اور حل کا نام فلسفہ ہے۔ فلسفہ کو تعریف کے کوزے میں بند کرنا ممکن نہیں لہذا زمانہ قدیم سے اس کی تعریف متعین نہ ہوسکی فلسفہ علم وآگہی کا علم ہے، یہ ایک ہمہ گیر علم ہے، جو وجود کے اغراض اور مقصد دریافت کرنے کی سعی کرتا ہے۔ لغت میں فلسفہ کے معانی ہیں، جب دانش، تجربہ، مشاہدہ، اور غور فکر سے اصول اخذ کرنا، تلاش حقیقت۔ افلاطون کے مطابق فلسفہ اشیا کی ماہیت کے لازمی اور ابدی علم کا نام ہے۔ جبکہ ارسطو کے نزدیک فلسفہ کا مقصد یہ دریافت کرنا ہے کہ وجود بذات اپنی فطرت میں کیا ہے اور کانٹ اسے ادراک وتعقل کے انتقاد کا علم قرار دیتا ہے۔

کلیدگی الفاظ:۔ فلسفہ، شاعری، سماج، شعور، فطرت، حقیقت وغیرہ وغیرہ۔

متن مقالہ:۔ فلسفہ اصل میں یونانی زبان کا لفظ ہے۔ یونانی زبان اور یونان کے علمی تاریخ کے ماہرین کا کہنا ہے عربی زبان میں فلنے کا لفظ یونانی زبان کے لفظ فیلسوفیہ کی عربی صورت اور مماثل ہے۔ فیلسوفیہ کا لفظ یونانی زبان کے دو لفظوں فیلو اور صوفہ سے مرکب ہے۔ فیلو کا معنی محبت ودوستی اور صوفیا کا معنی علم وحکمت ہے لہذا فیلسوفیہ کے معنی محبت علم وحکمت ہوئے یا حکمت سے محبت، اسی لئے فیلسوف

اس شخص کو کہا جاتا ہے جو علم و حکمت کا دوست اور شیدائی ہو۔ مشہور و معروف فلسفیوں نے فلسفہ کی تعریفیں اس طرح بیان کی ہیں۔ افلاطون نے کہا:

''فلسفی وہ ہوتا ہے، جو اس آدمی کے برعکس جو ظواہر اور حسی معلومات پر انحصار کرتا ہے اشیا کی حقیقت اور کنا کو سمجھتا ہے مطلب یہ کہ فلسفہ اشیاء کی حقیقت اور کنا کو سمجھنے کی اہلیت کا نام ہے۔''

ارسطو: ''فلسفہ وہ علم ہے جس کا کام یہ دریافت کرنا ہے کہ وجود کی اصل ماہیت یا وجود بذات خود اپنی فطرت میں کیا ہے۔ اور کہ وجود کے اغراض و خواص اس کی اپنی قدر کے لحاظ سے کیا ہیں مختصر الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ فلسفہ اصول اولیہ کا علم ہے۔''

مختصر یہ کہ فلسفہ وہ عمل ہے جس میں عقل و استدلال کے ذریعے کسی شے کی انتہائی حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور فلسفی وہ وہ لوگ ہیں جو ازلی و ابدی اور ادیم از تعبیر کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور اشیا کی فطری ماہیت کے لازمی اور ابدی علم کا نام فلسفہ ہے۔ تاریخ میں ارسطو شاید وہ پہلا شخص ہے جس نے اس طرح کے مسائل کو باضابطہ ایک شکل دینے کی کوشش کی، البتہ مسائل کی اس شکل کو کوئی مخصوص نام دینے میں وہ بھی ناکام رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ اس کے بعد اس کے افکار و خیالات کو ایک انسائکلو پیڈیا کی شکل میں جمع کیا گیا، تو ان مسائل کے لئے کوئی عنوان مقرر نہیں کیا گیا لیکن چونکہ اس طرح کے مسائل کو طبیعیات کے بعد جگہ لی تھی، اس لئے انھیں جو نام ملا وہ بعد الطبعیات تھا۔ اور آگے چل کر ان مسائل کو اسی نام سے شہرت ملی۔ کہا جاتا ہے کہ اس علم کو فلسفے کا نام فیثا غورث نے دیا اسی طرح یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ فیلسوف کا لفظ اصطلاح کے طور پر سب سے پہلے سقراط کے لئے استعمال ہوا لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ فلسفہ اور فیلسوف کی اصطلاح بعد میں رائج ہوئی کیونکہ ارسطو نے بھی اس لفظ کو کہیں استعمال نہیں کیا ہے۔ فلسفہ کو ان معنوں میں ام العلوم کہہ سکتے ہیں کہ یہ موجودہ دور کے تقریباً تمام علوم کا منبع و ماخذ مانا جاتا ہے۔ ریاضی علم طبیعیات، علم کیمیا، علم منطق، علم نفسیات، معاشرتی علوم سب اسی فلسفے کے عطا کردہ ہیں۔ فلسفیانہ شاعری اگر انسان کی تاریخ کو کھول کر دیکھ لیا جائے، تو ہمیں صاف نظر آجائے گا کہ صدیوں سے ریوں سے کتنی عظیم شخصیت گزری ہیں اور کے ہی ظالم حکمران بھی اس فانی دنیا سے کوچ کر چکے ہیں۔ حکومت کی بات جب ذہن میں نمودار ہوتی ہے، تو کسی خوشحال دور حکومت کو یاد رکھا جاتا ہے، اگر چہ کچھ حکمران ہمیں ایسے ملتے ہیں کہ جو انسان دوست تھے، انھوں نے اپنی حکومت کے دوران اپنی رعایا سے ہمیشہ خوش دلانہ انداز میں پیش آئے، تا کہ رعایا کو حکومت میں انصاف ملے۔ قدیم زمانے میں جنگیں لڑی جاتی تھیں اور

لاکھوں لوگ اس حولناک حادثے کی بدولت جان کھو بیٹھتے تھے،جس کے نتیجے میں انسانی زندگی کی کوئی قدر نہیں تھی، وحشی اور حیوانی کردار عام تھے، کیونکہ مختلف قبیلے ایک دوسرے سے لڑائیاں لڑتے تھے۔ معمولی فرق کو اپنا توہین سمجھتے تھے اور ضد کا نام قوم پرستی رکھا جاتا تھا جو کہ حقیقت کے برعکس تھا۔ ہر دور میں معاشرے میں الگ الگ قسم کے دانشور لوگ پیدا ہوے ہیں،جن کا کردار انسانی معاشرے میں نمایاں ہے۔ جب انسان نے طرح طرح کے قبیلوں میں بسنا شروع کیا،تو لوگ تقسیم ہوتے گئے یہاں تک کہ مختلف فرقوں اور قوموں میں تقسیم ہو گئے۔ایک قوم دوسری قوم سے برتری حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کا حربہ اپناتی تھی، آخر کار اس دوران مذاہب وجود میں آئے۔ بہت سی چیزوں اور علوم وفنون کا پتہ ہمیں مصر و یونان سے چلتا ہے۔اس زمانے کو دیکھا جائے،تو انسان کی اول سیولئزیشن کا دور تھا۔ اگر قدیم مصری لوگ نہ ہوتے،تو شاید آج ہم بہت پیچھے رہ چکے ہوتے۔ بیمار اور لا چار معاشرے کے لئے ایک ہی دوائی درکار ہوتی ہے، وہ دوائی صرف اور صرف فلاسفر اور شاعر کے پاس موجود ہوتی ہے۔شاعر اور فلاسفر کو نہ تخت کا نشہ ہوتا ہے اور نہ ہی عیش وعشرت کا۔معاشرے میں عجیب وغریب مسائل پائے جاتے ہیں اس دوران شاعر زیادہ تر غریب ولا چار طبقوں پر ظلم و جبر کے خلاف لکھتا ہے۔عموماً تاریخ میں جو بھی شاعر آئے انہوں نے تنقیدی شاعری کی۔تنقیدی شاعروں میں بہت سے لوگ شامل ہیں جو دنیا کے ہر کونے میں موجود تھے اور آج بھی پائے جاتے ہیں،جن میں ڈی۔ایچ۔لیورنیس،شیکسپئر ، چوسر، رومی، عطار، عرفی، اقبال، گرونانک، اور کبیر داس وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ان شعراء نے معاشرے اور مذہب پر اس طرح سے شاعری کی،جس سے سماج میں ایک تحریک، پیدا ہوئی جس کے عوض بہت سی تبدیلیاں رونماں ہوئیں،جنہیں ہم آج بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی شاعری زمانے کے لحاظ سے سماج کے حالات پر چوٹ کرتی ہیں اور ایک صالح معاشرے کی دعوت دیتی ہے۔یوں تو فلسفانہ شاعری دنیا کی بہت سی زبانوں میں ملتی ہے لیکن فارسی شاعری میں فلسفینہ خیالات کا جس قدر ذخیرہ ہے اور کی زبان میں نہیں، کیونکہ مولانا رومی جیسے دنیا کے دوسرے کسی زبان وادب میں پیدا نہیں ہوئے، بلکہ رومی کی شاعری سے متاثر ہو کر دوسری زبانوں کے شاعروں نے فلسفیانہ اور صوفیانہ شاعری میں طبع آزمائی کی۔ یہاں لسفیانہ شاعری سے مراد فلسفیانہ مسای ل اور خیالات ہیں جو کسی الگ نام سے موسوم نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ علم میں جو کچھ موجود ہے بلکہ کاروبار زندگی کی روزمرہ کی باتیں اگر نگاہ حقیقت سے دیکھی جائیں،تو سب فلسفہ ہیں۔مولانا رومی فرماتے ہیں:

''ہر کس نہ شناسندہ راز است وگر نہ این ہا ہمہ راز است کہ مفہوم عوام است''

شاعری میں فلسفہ کا جو سرمایہ ہے وہ انسان کی زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی کرتا ہے، خواہ وہ انسان کی عبادات سے تعلق رکھتے ہوں یا اخلاق و کردار سے شاعروں نے انسان کو جگانے کی کوشش کی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں شاعری ''شاعری فلسفہ تصوف کے راستے سے آیا چونکہ اکثر تصوف کی حد فلسفہ سے ملتی ہے، اس لئے صوفی شعرا فلسفہ کے مسائل بھی ادا کیا کرتے تھے، امام غزالی کی بدولت فلسفہ کو عام رواج ہوا، صوفیہ میں اکثر علماء مثلاً مولانا روم، سعدی، سنائی، نے صوفی ہونے سے پہلے باقاعدہ فلسفہ کی تعلیم پائی تھی، صوفی ہونے کے بعد فلسفیانہ خیالات نے قلب بدل دیا، اور تصوف کے پیرایہ میں ادا ہوئے، چنانچہ مولانا روم کی مثنوی میں سیکڑوں مسائل ہیں جو خالص فلسفہ کے مسائل ہیں۔''

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ناصر خسرو نے فلسفیانہ خیالات کو شاعری میں داخل کیا ہے، جو اس بات کے قائل تھے کہ شریعت کے دو رخ ہیں، ظاہر و باطن صرف امام وقت ہی سمجھ سکتا ہے اور وہی اصل مقصود ہے، ان کا اصول تھا کہ جب کسی کو اپنے خیالات میں لانا چاہتے تھے تو قرآن اور حدیث کے منصوصات اور احکام کے متعلق اس کے دل میں شکوک پیدا کرتے تھے، مثلاً یہ کہ روزہ سے کیا فائدہ؟ غسل جنابت کے کیا معنی ہیں؟ حجر اسود کو چومنا اور دیدار کرنا بظاہر بے فائدہ ہے، جب یہ سب دل کو پکڑ لیتے تھے اور وہ تسکین چاہتا تھا تو کہتے تھے کہ رمز کی باتیں ہیں، ان کو امام وقت کے سوا کوی؟ نہیں جانتا، امام کے ہاتھ پر بیت کیا جاے؟ تو یہ مسائل حل ہوں گے۔ ناصر خسرو کی شاعری کا ایک بڑا عنصر اسی قسم کے خیالات ہیں، وہ افلاک اور ستاروں کے قدیم ہونے کا قائل تھا اور ستاروں کو ذی روح اور بدبر عالم مانتا تھا۔ اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں:

''اقبال کا فلسفہ زندگی کہتا ہے کہ دنیا کو سائنس اور مشینی صنعت سے منہ موڑ کر قدیم مذہبی نظام کی طرف آنا چاہیے جس کی تدوین مومنوں کے ہاتھ ہوگی۔ یہ نظام قائم کرنے کے لیے شاہیں کی مثال پر عمل کرنا ہوگا۔ یعنی بوقت ضرورت جبر سے کام لینا ہوگا۔''

حالانکہ اقبال کی شاعری نے جس طرح سے مسلمانوں کے دلوں کو جھنجھوڑا، ان کی تہذیب گم گشتہ کی بازیافت کے لیے جس طرح تاریخ اور فلسفہ کے حوالے سے گفتگو کی اور اسلامی روایات کے استحکام کے لیے اپنے مذہبی تعلیمات، قرآن و حدیث کے خرمن سے خوشہ چینی کی وہ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے لیے خواب بیداری سے غفلت کا سبب بنی، بلکہ ادب عالی کا ایک شاہکار نمونہ بھی قرار

دی گئی۔لیکن چونکہ ان کا جرم یہ تھا کہ ان کی شاعری کا تانا بانا اسلام تھا جہاں سے وہ اپنی فکر کشید کرتے تھے اس لیے ان پر مذکورہ بالا الزامات عائد کیے گئے۔ رشید احمد صدیقی علامہ اقبال کے دفاع میں فرماتے ہیں:

''اقبال کو کمیونسٹ (فرقہ پرست) بتایا جاتا ہے جس دیار میں فرقہ پرسی کی وبا پھیلی ہوئی ہو وہاں بڑی شاعری اور بڑا شاعر کا تصور ذہنوں میں نہیں آسکتا، اقبال بڑے شاعر تھے اور بڑا شاعر کمیونسٹ نہیں ہوسکتا۔ ہمارے نقاد اس نکتے سے یقیناً باخبر ہوں گے کہ بڑے شاعر کی سرحدیں کمیونلزم سے نہیں انسانیت سے ملی ہوتی ہیں۔'' رشید احمد صدیقی آپ کے فلسفہ عشق اور علم کی مثال پیش کرتے ہیں

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین وظن
علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

اقبال کا پیغام یا فلسفہ حیات کیا ہے اگر چاہیں تو اس کے جواب میں صرف ایک لفظ ''خودی'' کہہ سکتے ہیں۔اس لئے کہ یہی ان کی فکر ونظر کے جملہ مباحث کا محوار ہے۔اور انھوں نے اپنے پیغام یا فسفہ حیات کو اس نام سے موسوم کیا ہے اور محور تک اقبال کی رسائی ذات وکائنات کے بارے میں بعض اہم سوالوں کے جوابات کی تلاش میں ہوئی ہے، انسان کیا ہے؟ انسانی زندگی کیا ہے؟ کائنات اور اس کی اصل کیا ہے؟ آیا یہ فی الواقع کوئی وجود رکھتی ہے یا محض فریب نظر ہے؟ اگر غریب نظر ہے تو اس کے پس پردہ کیا ہے؟ اس طرح کے اور نہ جانے کتنے سوالات کھڑے ہوتے ہیں، جن کے جوابات کی جستجو میں انسان شروع سے ہی سرگرداں رہا ہے۔ اقبال کے فلسفہ خودی یا پیغام کی تخلیق کا خاص پس منظر ہے، قیام یورپ کے زمانے میں انھوں نے فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ خودی کا لفظ اقبال کے پیغام یا فلسفہ حیات میں تکبر وغرور یا اردو، فارسی کے مروجہ معنوں میں استعمال نہیں ہوا، خودی اقبال کے نزدیک نام ہے، احساس غیرت مندی کا، جذبہ خود داری کا اپنی ذات وصفات کے پاس واحساس کا، اپنی انا کو جراحت وشکست سے محفوظ رکھنے کا، حرکت وتوانائی کو زندگی، کی ضامن سمجھنے کا مظاہراتِ فطرت سے برسرِ پیکار رہنے کا اور دوسروں کا سہارا تلاش کرنے کے بجائے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا، یوں سمجھ لیجئے کہ اقبال کے نقط ؟ نظر سے 'خودی' زندگی کا آغاز وسط اور انجام ہے، فرد وملت کی ترقی وپستی خودی کی ترقی وزوال پر منحصر ہے۔خودی کا تحفظ زندگی کا تحفظ، خودی کا استحکام زندگی کا استحکام، ازل سے ابد تک خودی ہی کی کارفرمائی ہے، اس کی کامرانیاں اور کارکشائیاں بے شمار اور اس کی وسعتیں اور بلندیاں بے کنار ہیں، اقبال نے ان کا ذکر اپنے کلام

میں جگہ جگہ نت نئے انداز سے کیا ہے۔

؎ خودی کیا ہے راز درون حیات — خودی کیا ہے راز درون حیات
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے — فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے
خودی ہے زندہ تو ہے فقر میں شہنشاہی — نہیں ہے سنجر وطغرل سے کم شکوہ فقیر
خودی ہو زندہ تو ہے دریائے بیکراں نایاب — خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیاں وحریر

ان کی شاعری سے انسان پر علم وحکمت کے ایسے اسرار کھلتے ہیں کہ وہ دنگ رہ جاتا ہے۔ اتنی گہرائی مقصد حیات اور کائنات کے اسرار ان کی شاعری میں پائے جاتے ہیں شاید ہی کسی شاعر نے بیان کئے ہوں۔ ان کی شاعری ہر عمر کے لوگوں کے لے ؟ سیکھنے کا پہلو رکھتی ہے۔ علامہ اقبال انسان کی زندگی کے فلسفہ کی تعمیر وتربیت کرتے ہیں وہ اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں کی تاریخ کی مثالیں پیش کرتے ہیں کہ جب مسلمانوں کو خودشناسی ہوئی تو اس نے انہیں اوج ثریا تک پہنچادیا، تو یہ آج کا انسان ہاں بھٹکتا پھر رہا ہے نہ سے اپنا ہوش اور نہ اپنی آنے والی نسلوں کا بس یہ اپنے نفس کا غلام بن کر رہ گیا ہے، جس نے اس سے صحیح اور غلط کی تمیز ہی نہیں چھینی بلکہ اس سے اس کی شناخت ہی چھین لی ہے اور اس کی شخصیت کو مسخ کر ڈالا ہے۔ ان کی شاعری قوم مسلم کی غیرت کی جاتی ہے۔

تیرے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے — خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے

ان کی شاعری میں پیغامِ کرب ورنج ہے کہ اے مسلمانوں تم صرف نام کے مسلماں کیوں تمہارا دل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا نرم، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا بہادر اور مولا علی کرم اللہ وجہہ جیسا نڈر بہادر کیوں نہیں ہے۔ ہم صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں۔ ان کی تعلیمات پر عمل کرنا ہم بھول گئے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: ؎

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور — ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر

ان کی شاعری مسلمانوں کے ضمیر کو جنجھوڑتی ہے۔ انہیں جگاتی ہے مُنہ سے صرف مسلمان ہوجانے والو عمل سے بھی مسلمان بنو۔ یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین ہے، جس نے اپنی بیٹی بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہ کو کہ دیا تا کہ تم یہ نہ سمجھتا کہ تم نبی کی بیٹی ہو، بلکہ تمہارا عمل ہی تم کو جنت میں لے جائے گا۔ تو ہم تمام مسلمان کس خواب غفلت میں کھو کر اپنی زندگیاں برباد کر رہے ہیں۔ یہ زمین و آسمان گواہ ہیں کہ جب مسلمانوں کو اپنی خودشناسی یا خودی کی پہچان ہوتی تب انہوں نے پوری دنیا میں اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑے اپنے اخلاق وکردار سے لوگوں کے دلوں کو تسخیر کرلیا۔ نہ صرف

دنیا پر راج کیا، بلکہ لوگوں کے دلوں پر بھی راج کیا، انہیں کے بارے علامہ اقبال کہتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا

نتیجہ گیری: اقبال نے دنیا کے انسانوں کو ایک عظیم فکر دی، جس سے انسان بیدار ہو گئے، اقبال کے اندر انسانیت کے لئے ایک ایسا درد تھا، جس نے اقبال کو بے قرار کیا، جس نے اقبال سے سکون چھین لیا، جس نے اقبال سے نالے اگلوائے، اقبال نے پورے مشرق میں خودی و خود اعتمادی، عزت نفس، جہاں بینی، اور جہاں بانی کا ولولہ پیدا کیا، اقبال نے نہ صرف مشرق کو اپنا کھویا ہوا وقار اور لٹی ہوئی آبرو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے جھنجھوڑا، بلکہ مغرب کے گمراہ کن تعقل اور فتنہ جو تجربہ و مشاہدہ کے سائنٹفک منہاج کو وحی الٰہی اور پیغمبرانہ اسوہ سے مستنیر کر کے انسانیت کے لئے فیض بخش اور حقیقی ارتقاء کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ اقبال نے نہ صرف شاعری کی دنیا میں ایک جدید شعور کا اظہار کیا ایک ایسا شعور جو مغربی تہذیب اور صنعتی تمدن کی بنیادی خامیوں سے باخبر تھا، بلکہ اس سے ایک ایسے ادراک سے روشناس کرایا جو ماضی، حال اور مستقبل تینوں پر محیط تھا۔ اقبال ماضی کی تابناک شعاعوں سے حال کی تاریکیوں کو دور کرنا چاہتے تھے اور ایک ایسے طلوع ہونے والے آفتاب کی بشارت دے رہے تھے، جو ایک نئی روحانی و اخلاقی تبدیلی کا نقط ؟ آغاز ہوگا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال فقط ایک شاعر ہی نہیں، بلکہ مفکر اور فلسفی بھی ہیں۔ ایک ایسے مفکر جنہوں نے حیات و کائنات کے مختلف اور متنوع مسائل پر غور و فکر کیا اور برسوں کی سوچ و فکر کے بعد شاعری اور نثر کے ذریعے حکیمانہ اور بصیرت افروز خیالات پیش کئے، جنہیں ان کی ندرتِ فکر کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے انسان کو خودی کا درس دیا ہے، علامہ اقبال کی خودی، خود پرستی نہیں ہے، خود سوزی نہیں ہے، بلکہ خود شناسی ہے، یعنی خود کو پہچانا، خود کی معرفت حاصل کرنا، انسان کو اللہ نے اس دنیا میں کیوں بھیجا ہے کہاں جانا ہے، کس لئے آیا ہے، اقبال کا خودی خود شناسی ہے، معرفت نفس ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی　　تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

حوالے وحواشی

فلسفیوں کا انسائیکلو پیڈیا، یاسر جواد، بک ہوم لاہور، ۲۰۰۵، صفحہ ۴۸

فلسفہ ہند و یونان شفیقی عہد پوری، دارالشعور لاہور، ۲۰۰۵، صفحہ ۸۹

مثنوی مولوی معنوی (جلد اول)، مولانا جلال الدین رومی، مترجم قاضی سجاد حسین، اسلامی کتب خانہ

لاہور،ص ۶۸۱
شعرالعجم (جلد پنجم) مولانا شبلی نعمانی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۱۹۹۱، صفحہ ۲۸۱
ادب اور انقلاب، اختر حسین رائے پوری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، صفحہ ۱۱۰
جدید غزل، رشید احمد صدیقی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ صفحہ ۳۶
جدید غزل، رشید احمد صدیقی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ صفحہ ۸۲۴
کلیات اقبال، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۱۰۲، صفحہ ۵۰۲
کلیات اقبال، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۱۰۲، صفحہ ۸۶۱
کلیات اقبال، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۱۰۲، صفحہ ۲۱۴
کلیات اقبال، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۱۰۲، صفحہ ۵۶۳

Qurrat-ul-Ain Hyder ke Novelon mein samaaji halaat ki akkasi by

Dr. Samina Khatoon (Darbhanga) cell- 9122319150
ڈاکٹر ثمینہ خاتون (دربھنگہ)

قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں سماجی حالات کی عکاسی

اردو فکشن میں قرۃ العین حیدر کا نام بڑے ہی ادب واحترام سے لیا جاتا ہے۔ان کی ادبی حیثیت ایک بڑے تناور درخت کی مانند ہے،جس کی جڑیں کافی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔وہ اردو ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ان کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت گہرا تھا اور تاریخ اور عمرانیات پر اچھی پکڑ تھی۔زبان و بیان سے بھی اچھی طرح واقف تھیں۔انہیں بہت کچھ وراثت میں ملا تھا۔ مغرب زدہ، روشن خیال طبقہ سے تعلق رکھنے والی تھیں۔اس لئے انہوں نے اپنی راہ خود بنائی۔علمی وادبی گھرانے میں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ان کے ماں باپ دونوں بلند پایہ ادیب تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی ایک عظیم ادیب وفنکار بن کر اردو دنیا میں خوب خوب شہرت حاصل کی۔قرۃ العین حیدر کے ناولوں کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو روشن کرتی ہیں کہ قوموں کا تہذیبی تشخص ان کی تاریخ میں افراد کا تشخص ان کے ماضی میں پنہاں ہوتا ہے۔ان کے یہاں ماضی اور حال دونوں کا تجربہ ایک ساتھ ملتا ہے۔قرۃ العین حیدر تاریخ،تہذیب وتمدن پر مضبوط گرفت رکھتی ہیں۔ہندوستانی اساطیری روایات اور تہذیبی رسوم سے ان کی خاص دلچسپی رہی ہے۔ان کے فکشن کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے تقسیم ملک اور اس کے بعد پیدا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات ہجرت اور اس طرح کے مسائل کو اپنے ناولوں میں اس طرح پیش کیا ہے کہ اس وقت کی سچی تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔دراصل وہ تقسیم ملک کے خلاف تھیں اس بات کا اظہار ان کے ناولوں میں ملتا ہے۔ملک کی تقسیم اور اس کے بعد کے مسائل کو قرۃ العین حیدر نے متاثر کن انداز سے پیش کیا ہے۔ تقسیم کے بعد نقل مکانی اپنی جڑوں سے کٹ جانے، اپنی تہذیب وثقافت سے الگ ہوجانے رسم و رواج سے دور ہوجانے کا دکھ درد ان کے کئی ناولوں میں ملتا ہے۔پروفیسر محمد حسن نے ایک جگہ کتنا صحیح فرمایا ہے:

''ان کے ناول اور افسانے پڑھتے وقت بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ اچانک کسی غیر مرئی طاقت نے اس حسین اور خوبصورت تہذیب کے شیرازے کو تقسیم ہند کے وقت درہم برہم کر دیا جس کی تعمیر میں صدیاں صرف ہوئی تھیں۔ تاریخ صرف سنہرے دھاگوں سے نہیں بنتی۔ اس کے حسن و قبح تاریک و روشن دونوں پہلو پر نظر رکھنی چاہئے۔ ہماری تاریخ میں تقسیم ہند کے عناصر موجود تھے۔۔ وہ ایسے ہندوستانی سماج کا نقشہ کھینچتی ہیں جہاں ہندو مسلمان سچ مچ شیر وشکر نظر آتے ہیں۔''

(جدید اردو ادب۔ ڈاکٹر محمد حسن، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۵ء، ص: ۵۳)

قرۃ العین حیدر نے جس وقت اپنا تخلیقی سفر شروع کیا وہ کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ ایک طرف سیاسی و معاشی طور پر ہنگامہ خیز زمانہ تھا تو دوسری طرح کئی اہم ادبی نظریات جنم لے رہے تھے۔ اس دور میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا اور ادب کو زندگی سے قریب لانے کی کوشش کی جانے لگی۔ اس ماحول میں قرۃ العین حیدر نے لکھنا شروع کیا انہوں نے ایک نئی حقیقت نگاری کی روایت قائم کی۔ وہ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی حامی تھیں۔

''میرے بھی صنم خانے'' قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول ہے جسے انہوں نے صرف ۱۹ سال کی عمر میں لکھا تھا۔ جس وقت یہ ناول لکھا گیا اس وقت ہندوستان آزاد ہو چکا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد دوقومی نظریے کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ تقسیم کے بعد سرحد کے دونوں طرف بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فساد ہوئے۔ صدیوں کی مشترکہ ہند اسلامی تہذیب درہم برہم ہوگئی۔ یہ آزادی ایک عظیم الشان سانحہ کی شکل میں سامنے آئی۔ تقسیم ملک کے بعد پیدا ہونے والے فسادات اور ہجرت کو موضوع بنا کر قرۃ العین حیدر نے ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینۂ غم'' اور ''آگ کا دریا'' لکھے۔ ''میرے بھی صنم خانے'' کو کچھ نقادوں نے جاگیردار طبقے کا زوال قرار دیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں جس طبقے کو پیش کیا ہے وہ سب ان کے اپنے طبقے ہیں۔ آزادی کے بعد سب سے زیادہ پریشان طبقہ غریبوں کا تھا۔ متوسط اور اعلیٰ طبقہ بھی آزادی کے بعد کچھ حد تک متاثر تھا کیونکہ جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اس ناول کا موضوع ہی اس طبقے کی نوجوان نسل کی خوابناک اور بے فکر دنیا کی تباہی ہے۔ ''سفینۂ غم'' قرۃ العین حیدر کا دوسرا ناول ہے اس ناول کا موضوع بھی تقسیم ملک، فرقہ وارانہ فسادات اور جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہے۔ ''میرے بھی صنم خانے'' اور سفینۂ غم'' میں بہت حد تک مماثلت ہے۔ دونوں کے کردار بھی کم وبیش ایک جیسے ہیں۔ یہ ناول بھی جاگیردار طبقے کے زوال کی کہانی پیش کرتا ہے:

''رضا بھائی کا یہ عالم تھا کہ جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو خود کو گوپال پور اور ملہر پور دونوں جگہ کا کرشن کنہیا

تصور کیا۔ ان کے علاوہ کنبہ کے تقریباً سارے افراد قصبے سے باہر مختلف شہروں میں رہتے تھے۔ ایک رضا بھائی اپنے مصاحبوں کے ساتھ پرانی سرائے کی گلیوں میں گلی، ڈنڈا کھیلنے اور رام گنگا کے گھاٹ پر آنے والی کہانیوں اور اہیرنیوں کے ساتھ راس لیلا رچاتے پروان چڑھے، بڑی دھوم دھام اور اللہ آمین کے ساتھ ان کو پہلا لامارٹیز، قانون پھر علی گڑھ بھیجا گیا، کیننگ کالج کی طرف سے یہ خدشہ تھا کہ لکھنؤ کی یہ ہوا ان کے لئے سونے پر سہاگے کا اثر رکھے گی۔ علی گڑھ میں ان کے لیے کوٹھی لے لی گئی کیونکہ ہوسٹل میں رہنا شانِ وضع داری کے خلاف تھا۔'' (سفینۂ غمِ دل، ص:۱۲۸)

''آگ کا دریا'' کا اصل موضوع ہندوستان کا کلچر ہے جس کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کے آئینہ میں مصنفہ نے انسانی وجود کا مفہوم تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول کا آغاز، ڈھائی ہزار سال قبل کے زمانوں سے ہوتا ہے۔ اسے چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ قدیم ہندوستان، عہد وسطیٰ، انگریزوں کا زمانہ اور پھر جدید دور جو تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد کے دور پر مشتمل ہے۔ ''کار جہاں دراز ہے'' تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ قرۃ العین حیدر کا سوانحی ناول ہے۔ اس کی تیسری جلد ''شاہ راہِ حریر'' کے نام سے چھپی ہے۔ یہ کتاب سوانحی ہوتے ہوئے بھی اعلیٰ فنی پیش کش، ہیتی تجربے اور موضوعاتی تنوع کے باعث ہر خاص و عام میں مقبول ہو چکی ہے۔ اس سوانحی ناول میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وقت کے سامنے انسان کی ہستی مجبور ہے۔ شہر بستے ہیں پھر اجڑتے ہیں۔ ایک تہذیب مٹتی ہے تو دوسری تہذیب پیدا ہوتی ہے یہ وقت کا قانون ہے۔ اس ناول کی پہلی جلد میں قرۃ العین حیدر کے جد اعلیٰ سید کمال الدین کے ہندوستان آنے اور ان کی اولاد کے نہٹور پہنچنے کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری جلد میں ان کے اپنے خاندان کے افراد ہیں۔ تیسری جلد ''شاہ راہ حریر'' کے عنوان سے جو ان کے تمام ناول کے بعد ۲۰۰۲ میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں مصنفہ اور ان کے آباؤ اجداد کے ملنے جلنے والوں کا تذکرہ ہے، ساتھ ہی اس میں قرۃ العین حیدر کی زندگی کے کچھ واقعات بھی ہیں۔

''گردشِ رنگ چمن'' ایک ایسا ناول ہے جس میں ہندوستانی تاریخ کے طویل عرصے کے تناظر میں کئی کرداروں کی زندگی کے نشیب و فراز سامنے آئے ہیں۔ اس ناول کا پلاٹ ایک وسیع کینوس پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کا زمانہ ۱۸۵۷ سے لے کر دور حاضر تک ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں عہد جدید کے رزم کو پوری جانبداری سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول کے واقعات کا جائے وقوع ہندوستان کے بڑے تہذیبی مرکز دہلی، کولکاتا اور لکھنؤ ہیں۔ اس ناول میں ستاروں اور پرندوں کو علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

''چاندنی بیگم'' قرۃ العین حیدر کا ایک اچھا ناول ہے۔اس کے کردار کو غیر روایتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔''چاندنی بیگم'' میں چودہ ابواب ہیں ۔مصنفہ نے پوری دیانتداری کے ساتھ اس ناول میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا ایک محمل کی جگہ ہے۔ جہاں ہر لمحہ غیر یقینی اور اتفاقی تبدیلیوں اور حادثوں سے گزرنا پڑتا ہے۔اس ناول میں چاندنی بیگم تھوڑی دیر کے لئے داخل ہوتی ہے اور پھر ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو جاتی ہے۔اس ناول میں مصنفہ فلسفی دکھائی دینے کے ساتھ ساتھ اخلاق پرست بھی نظر آتی ہیں۔قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی فضا ملتی ہے۔وقت کی ان دیکھی قوت کے آگے انسان مجبور ہے۔تاریخ منٹوں میں انسان کی قسمت کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ان کے ناولوں کی خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے ناولوں میں مختلف باب میں مختلف مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ان کے یہاں مناظر تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ان کے ناولوں کے پلاٹ اپنی تشکیل کے اعتبار سے غیر روایتی ہوتے ہیں۔مصنفہ نے ضرورت کے مطابق اپنے ناولوں میں شعور کی رو کی تکنیک سے کام لیا ہے۔اس کے علاوہ ان کے یہاں فلیش بیک کی تکنیک کا بھی استعمال ہوا ہے۔وہ موضوع کو کرداروں کے عمل کے بجائے ذہن کے حوالے سے پیش کرتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے یہاں زبان کی بھی بہت اہمیت ہے۔ان کا طرز نگارش رومان زدہ ہے۔ان کے اسلوب کا رنگ شاعرانہ اور گہرا ہے۔ان سب کے باوجود ان کے یہاں سب سے نمایاں پہلو تاریخی شعور ہے۔قرۃ العین حیدر کے ناولوں کا ایک نمایاں پہلو سماج کی مختلف تہذیبی رویوں سے وجود میں آنے والی سماجی تحریکوں کا مختصر جائزہ لینا بھی ہے۔انہوں نے بنگال میں انقلابی تحریک، مسلم لیگ اور کانگریس کی تحریک، دہشت گردوں کے حملے اور دہشت گرد تحریک وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنے ناولوں میں سیاسی صورت حال کو بھی پیش کیا ہے۔ان کے ناولوں کے ذریعہ وید، پران، مہابھارت، گیتا اور رامائن کے اقوال، کالی داس، مہابیر جین، بھرت منی، نظر الاسلام اور رابندر ناتھ ٹیگور وغیرہ کے فلسفے ہمارے سامنے آئے ہیں۔

مختصر یہ کہ قرۃ العین حیدر پہلی ایسی ناول نگار ہیں جنہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ عہد قدیم، عہد وسطی اور عہد جدید کے تہذیب و تمدن کی نشاندہی کی ہے۔اردو ناول نگاری میں ان کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جاتا رہے گا۔

☆☆☆